

اور یہ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے نہ اپنی بادشاہت میں کسی کو شریک و ساجھی رکھتا ہے اور نہ وہ کمزور ہے کہ اسے کسی حمایتی کی ضرورت ہو اور تو اس کی پوری پوری بڑائی بیان کرتا رہ۔ (۱۱۱)

سورہ کف کی ہے اور اس میں ایک سو دس آیات اور بارہ رکوع ہیں۔

بڑے مہربان اور سب سے زیادہ رحم کرنے والے اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔

تمام تعریفیں اسی اللہ کے لیے سزاوار ہیں جس نے اپنے بندے پر یہ قرآن اتارا اور اس میں کوئی کسر باقی نہ

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَخْلُقْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمَلِكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وِلْيٌ مِنَ الدَّالِّ وَكَذَلِكَ نَكْتُمُ ۝

### سُورَةُ الْكَهْفِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا ۝

کر رہتے تھے، جب اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھاتے تو آواز قدرے بلند فرمالتے، مشرکین قرآن سن کر قرآن کو اور اللہ کو سب و شتم کرتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اپنی آواز کو اتنا اونچا نہ کرو کہ مشرکین سن کر قرآن کو برا بھلا کہیں اور نہ آواز اتنی پست کرو کہ صحابہ اللہ علیہم السلام بھی نہ سن سکیں۔ (البخاری۔ التوحيد، باب قول الله تعالى أنزله بعلمه والملائكة يشهدون۔ ومسلم، الصلاة، باب التوسط في القراءة،) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ ہے کہ ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوا تو دیکھا کہ وہ پست آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تو وہ اونچی آواز سے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے دونوں سے پوچھا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں جس سے مصروف مناجات تھا، وہ میری آواز سن رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میرا مقصد سوتوں کو جگانا اور شیطان کو بھگانا تھا۔ آپ ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے فرمایا، اپنی آواز قدرے بلند کرو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا، اپنی آواز کچھ پست رکھو (مشکوٰۃ، باب صلوة اللیل، بحوالہ ابو داؤد، ترمذی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ آیت دعا کے بارے میں نازل ہوئی ہے) (بخاری و مسلم، بحوالہ فتح القدر)

☆ کف کے معنی غار کے ہیں۔ اس میں اصحاب کف کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اس لیے اسے سورہ کف کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی دس آیات اور آخری دس آیات کی فضیلت احادیث میں بیان کی گئی ہے کہ جو ان کو یاد کرے اور پڑھے گا، وہ فتنہ و دجال سے محفوظ رہے گا (صحیح مسلم، فضل سورة الكهف) اور جو اس کی تلاوت جمعے کے دن کرے گا تو آئندہ جمعے تک اس کے لیے ایک خاص نور کی روشنی رہے گی، (مستدرک حاکم، ۲/۳۶۸ و صحیحہ الألبانی

چھوڑی۔<sup>(۱)</sup>

بلکہ ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک رکھا تاکہ اپنے<sup>(۲)</sup> پاس کی سخت سزا سے ہوشیار کر دے اور ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبریاں سنا دے کہ ان کے لیے بہترین بدلہ ہے۔ (۲)

جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (۳)

اور ان لوگوں کو بھی ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے۔<sup>(۳)</sup>

درحقیقت نہ تو خود انہیں اس کا علم ہے نہ ان کے باپ دادوں کو۔ یہ تمہمت<sup>(۴)</sup> بڑی بری ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے وہ نرا جھوٹ بک رہے ہیں۔ (۵)

پس اگر یہ لوگ اس بات<sup>(۵)</sup> پر ایمان نہ لائیں تو کیا آپ ان کے پیچھے اسی رنج میں اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے؟ (۶)

فَيَسْأَلُكَ الَّذِينَ رِثَا سَأَلُوا مَنْ لَدُنْهُ وَيُبَيِّنُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنْ لَهُمْ أَجْرٌ حَسَنًا ﴿١٠﴾

ثُمَّ يَكْتُمُونَ فِيهِ أَبَدًا ﴿١١﴾

وَيُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ﴿١٢﴾

مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً

تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا ﴿١٣﴾

فَلَعَلَّكَ بَاطِلٌ مُفْتَضِلٌ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا

بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ﴿١٤﴾

<https://surahkahf.com/in-urdu/>

فی صحیح الجامع الصغیر نمبر ۶۳۷۰ اس کے پڑھنے سے گھر میں سکینت و برکت نازل ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے سورہ کف پڑھی گھر میں ایک جانور بھی تھا وہ بدکنا شروع ہو گیا، انہوں نے غور سے دیکھا کہ کیا بات ہے؟ تو انہیں ایک بادل نظر آیا، جس نے انہیں ڈھانپ رکھا تھا، صحابی رضی اللہ عنہ نے اس واقعے کا ذکر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا، اسے پڑھا کرو۔ قرآن پڑھتے وقت سکینت نازل ہوتی ہے۔ (صحیح بخاری)

فضل سورة الكهف - مسلم 'كتاب الصلوة' باب نزول السكينة بقراءة القرآن

(۱) یا کوئی کجی اور راہ اعتدال سے انحراف اس میں نہیں رکھا بلکہ اسے قیم یعنی سیدھا رکھا۔ یا قیم کے معنی، بندوں کے دینی و دنیوی مصالح کی رعایت و حفاظت کرنے والی کتاب۔

(۲) مِنْ لَدُنْهُ جو اس اللہ کی طرف سے صادر یا نازل ہونے والا ہے۔

(۳) جیسے یہودیوں، عیسائیوں اور بعض مشرکین (فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں) کا عقیدہ ہے۔

(۴) اس کلمہ (تمہمت) سے مراد یہی ہے کہ اللہ کی اولاد ہے جو نرا جھوٹ ہے۔

(۵) بِهَذَا الْحَدِيثِ (اس بات) سے مراد قرآن کریم ہے۔ کفار کے ایمان لانے کی جتنی شدید خواہش آپ ﷺ رکھتے تھے اور ان کے اعراض و گریز سے آپ ﷺ کو جو سخت تکلیف ہوتی تھی، اس میں آپ ﷺ کی اسی کیفیت اور جذبے کا اظہار ہے۔

روئے زمین پر جو کچھ <sup>(۱)</sup> ہے ہم نے اسے زمین کی رونق کا باعث بنایا ہے کہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون نیک اعمال والا ہے۔ (۷)

اس پر جو کچھ ہے ہم اسے ایک ہموار صاف میدان کر ڈالنے والے ہیں۔ <sup>(۲)</sup> (۸)

کیا تو اپنے خیال میں غار اور کتبے والوں کو ہماری نشانیوں میں سے کوئی بہت عجیب نشانی سمجھ رہا ہے؟ <sup>(۳)</sup> (۹)

ان چند نوجوانوں نے جب غار میں پناہ لی تو دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے کام میں ہمارے لیے راہ یابی کو آسان کر دے۔ <sup>(۴)</sup> (۱۰)

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَهُمُ لَنُبْلُوهُمْ بِهَا  
أَحْسَنُ عَمَلًا ۝

وإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيِّمِ كَانُوا مِن  
إِلٰهِنَا عِجَابًا ۝

إِذْ أَدْوَى الْقَيْتِيَّةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا مِن  
رَحْمَتِكَ وَهِيَئِ لَنَا مِن أَمْرِنَا شَدًّا ۝

(۱) روئے زمین پر جو کچھ ہے، حیوانات، جمادات، نباتات، معدنیات اور دیگر مدفون خزانے، یہ سب دنیا کی زینت اور اس کی رونق ہیں۔

(۲) صَعِيدًا صاف میدان، جُرُزًا بالکل ہموار، جس میں کوئی درخت وغیرہ نہ ہو۔ یعنی ایک وقت آئے گا کہ یہ دنیا اپنی تمام تر رونقوں سمیت فنا ہو جائے گی اور روئے زمین ایک چٹیل اور ہموار میدان کی طرح ہو جائے گی، اس کے بعد ہم نیک و بد کو ان کے عملوں کے مطابق جزا دیں گے۔

(۳) یعنی یہ واحد بڑی اور عجیب نشانی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری ہر نشانی ہی عجیب ہے۔ یہ آسمان و زمین کی پیدائش اور اس کا نظام، شمس و قمر اور کواکب کی تسخیر، رات اور دن کا آنا جانا اور دیگر بے شمار نشانیاں، کیا کم تعجب انگیز ہیں کھف، اس غار کو کہتے ہیں جو پہاڑ میں ہوتا ہے۔ رقیم، بعض کے نزدیک اس بستی کا نام ہے جہاں سے یہ نوجوان گئے تھے، بعض کہتے ہیں اس پہاڑ کا نام ہے جس میں غار واقع تھا بعض کہتے ہیں رَقِيمٌ بمعنی مَرْقُومٌ ہے اور یہ ایک تختی ہے لوہے یا سیسے کی، جس میں اصحاب کھف کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اسے رقیم اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس پر نام تحریر ہیں۔ حالیہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ جس پہاڑ میں یہ غار واقع ہے اس کے قریب ہی ایک آبادی ہے جسے اب الرقیب کہا جاتا ہے جو مرور زمانہ کے سبب الرقیم کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(۴) یہ وہی نوجوان ہیں جنہیں اصحاب کھف کہا گیا (تفصیل آگے آرہی ہے) انہوں نے جب اپنے دین کو بچاتے ہوئے غار میں پناہ لی تو یہ دعا مانگی۔ اصحاب کھف کے اس قصے میں نوجوانوں کے لیے بڑا سبق ہے، آج کل کے نوجوانوں کا بیشتر وقت فضولیات میں برباد ہوتا ہے اور اللہ کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ کاش! آج کے مسلمان نوجوان اپنی جوانیوں کو اللہ کی عبادت میں صرف کریں۔

پس ہم نے ان کے کانوں پر گنتی کے کئی سال تک اسی غار میں پردے ڈال دیے۔<sup>(۱)</sup>

پھر ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا کہ ہم یہ معلوم کر لیں کہ دونوں گروہ میں سے اس انتہائی مدت کو جو انہوں نے گزاری کس نے زیادہ<sup>(۲)</sup> یاد رکھی ہے۔ (۱۲)

ہم ان کا صحیح واقعہ تیرے سامنے بیان فرما رہے ہیں۔ یہ چند نوجوان<sup>(۳)</sup> اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں ترقی دی تھی۔ (۱۳)

ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیے<sup>(۴)</sup> تھے جبکہ یہ اٹھ

فَضْرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ۝

ثُمَّ بَعَثْنَا لَهُمْ لَمَعَةً مِّنَ الْحَيَاتِ لِيُبَيِّنُوا آلَمَدَا ۝

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْنَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ  
وَزِدْنَا لَهُمُ هُدًى ۝

وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَوَاتِ

(۱) یعنی کانوں پر پردے ڈال کر ان کے کانوں کو بند کر دیا تاکہ باہر کی آوازوں سے ان کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے انہیں گہری نیند سلا دیا۔

(۲) ان دو گروہوں سے مراد اختلاف کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ یا تو اسی دور کے لوگ تھے جن کے درمیان ان کی بابت اختلاف ہوا، یا بعد رسالت کے مومن و کافر مراد ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصحاب کھف ہی ہیں ان کے دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ ہم اتنا عرصہ سوئے رہے۔ دوسرا اس کی نفی کرتا اور فریق اول سے کم و بیش مدت بتلاتا۔

(۳) اب اجمال کے بعد تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔ یہ نوجوان، بعض کہتے ہیں عیسائیت کے پیروکار تھے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ کہتے ہیں ایک بادشاہ تھا، دقیانوس، جو لوگوں کو بتوں کی عبادت کرنے اور ان کے نام کی نذر نیاز دینے کی ترغیب دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان چند نوجوانوں کے دلوں میں یہ بات ڈال دی کہ عبادت کے لائق تو صرف ایک اللہ ہی ہے جو آسمان و زمین کا خالق اور کائنات کا رب ہے۔ فِتْنَةٌ جمع قلت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد ۹ یا اس سے بھی کم تھی۔ یہ الگ ہو کر کسی ایک جگہ اللہ واحد کی عبادت کرتے آہستہ آہستہ لوگوں میں ان کے عقیدہ توحید کا چرچا ہوا، تو بادشاہ تک بات پہنچ گئی اور اس نے انہیں اپنے دربار میں طلب کر کے ان سے پوچھا، تو وہاں انہوں نے برملا اللہ کی توحید بیان کی۔ بالآخر پھر بادشاہ اور اپنی مشرک قوم کے ڈر سے اپنے دین کو بچانے کے لیے آبادی سے دور ایک پہاڑ کے غار میں پناہ گزین ہو گئے، جہاں اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی اور وہ تین سو نو (۳۰۹) سال وہاں سوئے رہے۔

(۴) یعنی ہجرت کرنے کی وجہ سے اپنے خویش و اقارب کی جدائی اور عیش و راحت کی زندگی سے محرومی کا جو صدمہ انہیں اٹھانا پڑا، ہم نے ان کے دل کو مضبوط کر دیا تاکہ وہ ان شدائد کو برداشت کر لیں۔ نیز حق گوئی کا فریضہ بھی جرأت اور حوصلے سے ادا کر سکیں۔

کھڑے ہوئے<sup>(۱)</sup> اور کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے، ناممکن ہے کہ ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو پکاریں اگر ایسا کیا تو ہم نے نہایت ہی غلط بات کہی۔<sup>(۲)</sup> (۱۳)

یہ ہے ہماری قوم جس نے اس کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں۔ ان کی خدائی کی یہ کوئی صاف دلیل کیوں پیش نہیں کرتے اللہ پر جھوٹ افترا باندھنے والے سے زیادہ ظالم کون ہے؟ (۱۵)

جبکہ تم ان سے اور اللہ کے سوا ان کے اور معبودوں سے کنارہ کش ہو گئے تو اب تم کسی غار میں<sup>(۳)</sup> جا بیٹھو، تمہارا رب تم پر اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لیے تمہارے کام میں سولت مہیا کر دے گا۔ (۱۶)

آپ دیکھیں گے کہ آفتاب بوقت طلوع ان کے غار سے دائیں جانب کو جھک جاتا ہے اور بوقت غروب ان کے بائیں جانب کترا جاتا ہے اور وہ اس غار کی کشادہ جگہ میں ہیں۔<sup>(۴)</sup> یہ اللہ کی نشانیوں میں سے

وَالْأَرْضِ لَنُتَدْعُوَنَّ مِنْ دُونِهَا لَمَّا نُوَدِّعُهَا إِذَا شَطَطْنَا ۝

هَؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهَا آلِهَةً لَوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِمْ  
مُسلطِينَ بَيْنَ يَدَيْهِمْ فَأَنْظِمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذِبًا ۝

وَإِذَا عَزَلْتَ أُولَئِكَ فَأَنْزِلْ لَهُمُ الصَّيْحَانَ الْأُولَىٰ ۝

يَسْتَرْكَبُونَكَ كَبُرهٍ مِنْ رَحْمَتِهِ وَأَنْتَ لَكُم مِّنْ أَمْرٍ مُّتَّفَعًا ۝

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَوْرُوعًا مِّنْ مَّكَهٍ ذَاتِ الْيَمِينِ  
وَإِذَا غَرَبَتْ تَقَرُّصًا مِّنْ ذَاتِ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْ ذَلِكَ  
مِنَ آيَاتِ اللَّهِ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُضِلِّ

(۱) اس قیام سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک وہ ظلی ہے، جو بادشاہ کے دربار میں ان کی ہوئی اور بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے توحید کا یہ وعظ بیان کیا، بعض کہتے ہیں کہ شر سے باہر آپس میں ہی کھڑے، ایک دوسرے کو توحید کی وہ بات سنائی، جو فرداً فرداً اللہ کی طرف سے ان کے دلوں میں ڈالی گئی اور یوں اہل توحید باہم اکٹھے ہو گئے۔

(۲) شَطَطًا کے معنی جھوٹ کے یا حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔

(۳) یعنی جب تم نے اپنی قوم کے معبودوں سے کنارہ کشی کر لی ہے، تو اب جسمانی طور پر بھی ان سے علیحدگی اختیار کر لو۔ یہ اصحاب کھف نے آپس میں کہا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ ایک غار میں جا چھپے، جب ان کے غائب ہونے کی خبر مشہور ہوئی تو تلاش کیا گیا، لیکن وہ اسی طرح ناکام رہے، جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں کفار مکہ غار ثور تک پہنچ جانے کے باوجود، جس میں آپ ﷺ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ موجود تھے، ناکام رہے تھے۔

(۴) یعنی سورج طلوع کے وقت دائیں جانب کو اور غروب کے وقت بائیں جانب کو کترا کے نکل جاتا اور یوں دونوں وقتوں میں ان پر دھوپ نہ پڑتی، حالانکہ وہ غار میں کشادہ جگہ پر محو استراحت تھے۔ فَجْوَةٍ کے معنی ہیں کشادہ جگہ۔

فَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّشْرِكًا ۝

ہے۔ (۱) اللہ تعالیٰ جس کی رہبری فرمائے وہ راہ راست پر ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے ناممکن ہے کہ آپ اس کا کوئی کارساز اور رہنما پاسکیں۔ (۲) (۱۷)

آپ خیال کرتے کہ وہ بیدار ہیں، حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے، (۳) خود ہم ہی انہیں دائیں بائیں کروٹیں دلایا کرتے تھے، (۴) ان کا کتا بھی چوکھٹ پر اپنے ہاتھ پھیلانے ہوئے تھا۔ اگر آپ جھانک کر انہیں دیکھنا چاہتے تو ضرور ان کے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور ان کے رعب سے آپ پر دہشت چھا جاتی۔ (۵) (۱۸)

اسی طرح ہم نے انہیں جگا کر اٹھادیا (۶) کہ آپس میں پوچھ گچھ کر لیں۔ ایک کہنے والے نے کہا کہ کیوں بھی تم کتنی دیر ٹھہرے رہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک دن یا ایک دن سے بھی کم۔ (۷) کہنے لگے کہ تمہارے ٹھہرے

وَمَحْسَبُهُمْ آيَاتًا وَهُمْ رُقُودٌ ۚ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ  
وَذَاتَ الشِّمَالِ ۚ وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ لَوِ اطَّلَعَتْ  
عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتُ مِنْهُمْ فِرَارًا وَكَلِمَاتٍ مِنْهُمْ رُعبًا ۝

وَكَذَلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ  
كَمْ لَيْسْتُمْ قَالُوا لَيْسْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضُ يَوْمٍ قَالُوا رَبُّكُمْ  
أَعْلَمُ بِمَا لَيْسْتُمْ فَاذْعَبُوا ۚ أَحَدَكُمْ يَورِقُكُمْ هَذِهِ

(۱) یعنی سورج کا اس طرح نکل جانا کہ باوجود کھلی جگہ ہونے کے وہاں دھوپ نہ پڑے، اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

(۲) جیسے دقیانوس بادشاہ اور اس کے پیروکار ہدایت سے محروم رہے تو کوئی انہیں راہ یاب نہیں کر سکا۔

(۳) أَيْقَاطٌ، بَيْقَظٌ کی جمع اور رُقُودٌ، رِقَادٌ کی جمع ہے وہ بیدار اس لیے محسوس ہوتے تھے کہ ان کی آنکھیں کھلی ہوتی تھیں، جس طرح جاگنے والے شخص کی ہوتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ زیادہ کروٹیں بدلنے کی وجہ سے وہ بیدار بیدار نظر آتے تھے۔

(۴) تاکہ ان کے جسموں کو مٹی نہ کھا جائے۔

(۵) یہ ان کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتظام تھا تاکہ کوئی ان کے قریب نہ جاسکے۔

(۶) یعنی جس طرح ہم نے انہیں اپنی قدرت سے سلا دیا تھا، اسی طرح تین سو نو سال کے بعد ہم نے انہیں اٹھادیا اور اس حال میں اٹھایا کہ ان کے جسم اسی طرح صحیح تھے، جس طرح تین سو سال قبل سوتے وقت تھے، اسی لیے آپس میں ایک دوسرے سے انہوں نے سوال کیا۔

(۷) گویا جس وقت وہ غار میں داخل ہوئے، صبح کا پہلا پہر تھا اور جب بیدار ہوئے تو دن کا آخری پہر تھا، یوں وہ سمجھے کہ شاید ہم ایک دن یا اس سے بھی کم، دن کا کچھ حصہ سوئے رہے۔

رہنے کا بخوبی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔<sup>(۱)</sup> اب تو تم اپنے  
میں سے کسی کو اپنی یہ چاندی دے کر شہر بھیجو وہ خوب  
دیکھ بھال لے کہ شہر کا کون سا کھانا پاکیزہ تر ہے،<sup>(۲)</sup> پھر  
اسی میں سے تمہارے کھانے کے لیے لے آئے، اور وہ  
بہت احتیاط اور نرمی برتتے اور کسی کو تمہاری خبر نہ  
ہونے دے۔<sup>(۳)</sup> (۱۹)

اگر یہ کافر تم پر غلبہ پالیں تو تمہیں سنگسار کر دیں گے یا  
تمہیں پھر اپنے دین میں لوٹالیں گے اور پھر تم کبھی بھی  
کامیاب نہ ہو سکو گے۔<sup>(۴)</sup> (۲۰)

ہم نے اس طرح لوگوں کو ان کے حال سے آگاہ کر<sup>(۵)</sup>  
دیا کہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ بالکل سچا ہے اور

إِلَى الْمَدِينَةِ فَلَیُنظُرْنَ إِلَيْهَا أَزْكَی طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقِ  
مِنْهُ وَلِیَسْتَكْفِفُوا وَلَا یُشْعِرَنَّ بَکُمْ أَحَدًا ۝

إِن تَهْمُرْنَ یُظْهِرُوا عَلَیْکُمْ بِرِجْمِکُمْ أَوْ یُعِیْدُوا کُمْ  
فِی مَلَکِیْتِهِمْ وَلَکِنْ تَفْلِحُوا إِذَا أَبَدْنَا ۝

وَكَذَٰلِكَ أَعْتَرْنَا عَلَیْهِمْ لَیْعَلْمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ  
وَ أَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیْبَ فِیْهَا إِذْ یَتَنَازَعُونَ

(۱) تاہم کثرت نوم کی وجہ سے وہ سخت تردد میں رہے اور بالآخر معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا کہ وہی صحیح مدت جانتا ہے۔

(۲) بیدار ہونے کے بعد، خوراک جو انسان کی سب سے اہم ضرورت ہے، اس کا سرو سامان کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔

(۳) احتیاط اور نرمی کی تاکید اسی اندیشے کے پیش نظر کی، جس کی وجہ سے وہ شہر سے نکل کر ایک ویرانے میں آئے  
تھے۔ اسے تاکید کی کہ کہیں اس کے رویے سے شہر والوں کو ہمارا علم نہ ہو جائے اور کوئی نئی افتاد ہم پر نہ آپڑے، جیسا کہ  
انگلی آیت میں ہے۔

(۴) یعنی آخرت کی جس کامیابی کے لیے ہم نے یہ صعوبت، مشقت برداشت کی، ظاہریات ہے کہ اگر اہل شہر نے ہمیں  
مجبور کر کے پھر آبائی دین کی طرف لوٹا دیا، تو ہمارا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا، ہماری محنت بھی برباد جائے گی اور ہم نہ  
دین کے رہیں گے نہ دنیا کے۔

(۵) یعنی جس طرح ہم نے انہیں سلا یا اور جگایا، اسی طرح ہم نے لوگوں کو ان کے حال سے آگاہ کر دیا۔ بعض روایت  
کے مطابق یہ آگاہی اس طرح ہوئی کہ جب اصحاب کف کا ایک ساتھی چاندی کا وہ سکے لے کر شہر گیا، جو تین سو سال  
قبل کے بادشاہ دقیانوس کے زمانے کا تھا اور وہ سکے اس نے ایک دکاندار کو دیا، تو وہ حیران ہوا، اس نے ساتھ کی دکان  
والے کو دکھایا، وہ بھی دیکھ کر حیران ہوا، جب کہ اصحاب کف کا ساتھی یہ کہتا رہا کہ میں اسی شہر کا باشندہ ہوں اور کل ہی  
یہاں سے گیا ہوں، لیکن اس ”کل“ کو تین صدیاں گزر چکی تھیں، لوگ کس طرح اس کی بات مان لیتے؟ لوگوں کو شبہ  
گزر رہا کہ کہیں اس شخص کو مدون خزانہ نہ ملا ہو۔ شدہ شدہ بات بادشاہ یا حاکم مجاز تک پہنچی اور اس ساتھی کی مدد سے وہ  
غار تک پہنچا اور اصحاب کف سے ملاقات کی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر وہیں وفات دیدی (ابن کثیر)

بَيْنَهُمْ أَمْرُهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُيُوتَنَا رَبَّنَا  
أَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ  
لَنَنْخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَسْجِدًا ①

قیامت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔<sup>(۱)</sup> جبکہ وہ اپنے  
امر میں آپس میں اختلاف کر رہے<sup>(۲)</sup> تھے کہنے لگے  
ان کے غار پر ایک عمارت بنا لو۔<sup>(۳)</sup> ان کا رب ہی  
ان کے حال کا زیادہ عالم<sup>(۴)</sup> ہے۔ جن لوگوں نے ان  
کے بارے میں غلبہ پایا وہ کہنے لگے کہ ہم تو ان کے  
آس پاس مسجد بنالیں گے۔<sup>(۵)</sup> (۲۱)

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ  
سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ

کچھ لوگ تو کہیں گے کہ اصحاب کف تین تھے اور  
چوتھا ان کا کتا تھا۔ کچھ کہیں گے کہ پانچ تھے اور چھٹا  
ان کا کتا تھا،<sup>(۶)</sup> غیب کی باتوں میں اٹکل (کے تیرنے)

(۱) یعنی اصحاب کف کے اس واقعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قیامت کے وقوع اور بعث بعد الموت کا وعدہ الہی سچا  
ہے۔ منکرین کے لیے اس واقعے میں اللہ کی قدرت کا ایک نمونہ موجود ہے۔

(۲) اِذْ، یا تو طرف ہے اَعْتَرْنَا کا، یعنی ہم نے انہیں اس وقت ان کے حال سے آگاہ کیا، جب وہ بعث بعد الموت یا وقوع  
قیامت کے بارے میں آپس میں جھگڑ رہے تھے یا یہاں اَذْكُرْ محذوف ہے، یعنی وہ وقت یاد کرو، جب وہ آپس میں جھگڑ  
رہے تھے۔

(۳) یہ کہنے والے کون تھے، بعض کہتے ہیں کہ اس وقت کے اہل ایمان تھے، بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ اور اس کے ساتھی  
تھے، جب جا کر انہوں نے ملاقات کی اور اس کے بعد اللہ نے انہیں پھر سلا دیا، تو بادشاہ اور اس کے ساتھیوں نے کہا کہ  
ان کی حفاظت کے لیے ایک عمارت بنا دی جائے۔

(۴) جھگڑا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی بابت صحیح علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

(۵) یہ غلبہ حاصل کرنے والے اہل ایمان تھے یا اہل کفر و شرک؟ شوکانی نے پہلی رائے کو ترجیح دی ہے اور ابن کثیر نے  
دوسری رائے کو۔ کیونکہ صالحین کی قبروں پر مسجدیں تعمیر کرنا اللہ کو پسند نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا «لَعَنَ  
اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ» (البخاری، کتاب الجنائز، باب  
ما یکرہ من اتخاذا المساجد علی القبور۔ ومسلم، کتاب المساجد واتخاذا الصور فیہا) «اللہ تعالیٰ یہود و  
نصارائی پر لعنت فرمائے، جنہوں نے اپنے پیغمبروں اور صالحین کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا» حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں  
عراق میں حضرت دانیال علیہ السلام کی قبر دریافت ہوئی تو آپ نے حکم دیا کہ اسے چھپا کر عام قبروں جیسا کر دیا جائے۔  
تاکہ لوگوں کے علم میں نہ آئے کہ فلاں قبر فلاں پیغمبر کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

(۶) یہ کہنے والے اور ان کی مختلف تعداد بتلانے والے عمد رسالت کے مؤمن اور کافر تھے، خصوصاً اہل کتاب جو کتب  
سادیہ سے آگاہی اور علم کا دعویٰ رکھتے تھے۔

چلاتے ہیں،<sup>(۱)</sup> کچھ کہیں گے کہ وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا<sup>(۲)</sup> ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار ان کی تعداد کو بخوبی جاننے والا ہے، انہیں بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں۔<sup>(۳)</sup> پس آپ ان کے مقدمے میں صرف سرسری گفتگو ہی کریں<sup>(۴)</sup> اور ان میں سے کسی سے ان کے بارے میں پوچھ گچھ بھی نہ کریں۔<sup>(۵)</sup> (۲۲)

اور ہرگز ہرگز کسی کام پر یوں نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا۔ (۲۳)

مگر ساتھ ہی انشاء اللہ کہہ لینا۔<sup>(۶)</sup> اور جب بھی بھولے،

كَلْبَهُمْ فَلَ رَّبِّيَ اَعْلَمُ بِعَدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا  
فَلَا تَمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مَرَاةً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ  
فِيْهِمْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۝۲۲

وَلَا تَقُوْلُنَّ لِهٰٓئِهِ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ عَدَاۗءًا ۝۲۳

اِلَّا اَنْ يَنْشَاۗءَ اللّٰهُ وَاذْكُرْ رَبَّكَ اِذَا اَنْسَيْتَ وَقُلْ عَلٰى

(۱) یعنی علم، ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے، جس طرح بغیر دیکھے کوئی پتھر مارے، یہ بھی اسی طرح انکل پچو باتیں کر رہے ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے صرف تین قول بیان فرمائے، پہلے دو قولوں کو رَجَمًا بِالْغَيْبِ (ظن و تخمین) کہہ کر ان کو کمزور رائے قرار دیا اور اس تیسرے قول کا ذکر اس کے بعد کیا جس سے بعض اہل تفسیر نے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ انداز اس قول کی صحت کی دلیل ہے اور فی الواقع ان کی اتنی ہی تعداد تھی (ابن کثیر)

(۳) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ وہ کہتے تھے میں بھی ان کم لوگوں میں سے ہوں جو یہ جانتے ہیں کہ اصحاب کف کی تعداد کتنی تھی؟ وہ صرف سات تھے جیسا کہ تیسرے قول میں بتلایا گیا ہے (ابن کثیر)

(۴) یعنی صرف ان ہی باتوں پر اکتفاء کریں جن کی اطلاع آپ کو وحی کے ذریعے سے کر دی گئی ہے۔ یا تعین عدد میں بحث و تکرار نہ کریں، صرف یہ کہہ دیں کہ اس تعین کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۵) یعنی بحث کرنے والوں سے ان کی بابت کچھ نہ پوچھیں، اس لیے کہ جس سے پوچھا جائے، اس کو پوچھنے والے سے زیادہ علم ہونا چاہیے، جب کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو پھر بھی یقینی علم کا ایک ذریعہ۔ وحی۔ موجود ہے، جب کہ دوسروں کے پاس ظنون و اوهام کے سوا کچھ نہیں۔

(۶) مفسرین کہتے ہیں کہ یہودیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتیں پوچھی تھیں، روح کی حقیقت کیا ہے اور اصحاب کف اور ذوالقرنین کون تھے؟ کہتے ہیں کہ یہی سوالات اس سورت کے نزول کا سبب بنے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں تمہیں کل جواب دوں گا، لیکن اس کے بعد ۱۵ دن تک جبریل وحی لے کر نہیں آئے۔ پھر جب آئے تو اللہ تعالیٰ نے

اپنے پروردگار کی یاد کر لیا کرنا<sup>(۱)</sup> اور کہتے رہنا کہ مجھے پوری امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے بھی زیادہ ہدایت کے قریب کی بات کی رہبری کرے۔<sup>(۲)</sup> (۲۳)  
 وہ لوگ اپنے غار میں تین سو سال تک رہے اور نو سال اور زیادہ گزارے۔<sup>(۳)</sup> (۲۵)  
 آپ کہہ دیں اللہ ہی کو ان کے ٹھہرے رہنے کی مدت کا بخوبی علم ہے، آسمانوں اور زمینوں کا غیب صرف اسی کو حاصل ہے وہ کیا ہی اچھا دیکھنے سننے والا ہے۔<sup>(۴)</sup> سوائے اللہ کے ان کا کوئی مددگار نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ (۲۶)  
 تیری جانب جو تیرے رب کی کتاب وحی کی گئی ہے اسے

أَنْ يَهْدِيَنِي رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَذَا رَشَدًا ﴿۲۳﴾  
 وَلَيَسْئُرُنِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تَسْعًا ﴿۲۵﴾  
 قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَيْسُوا لَهُ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ وَلَا يَشِيرُكَ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ﴿۲۶﴾  
 وَأَنْزَلْنَا مَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنْ كِتَابٍ رَبِّكَ لُمُبْدِلِ الْكَلِمَاتِ

ان شاء اللہ کہنے کا یہ حکم دیا۔ آیت میں کل (عد) سے مراد مستقبل ہے یعنی جب بھی مستقبل قریب یا بعید میں کوئی کام کرنے کا عزم کرو تو ان شاء اللہ ضرور کما کرو۔ کیونکہ انسان کو تو پتہ نہیں کہ وہ جس بات کا عزم ظاہر کر رہا ہے، اس کی توفیق بھی اسے اللہ کی مشیت سے ملتی ہے یا نہیں؟

(۱) یعنی اگر کلام یا وعدہ کرتے وقت ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ، تو جس وقت بھی یاد آجائے ان شاء اللہ کہہ لو، یا پھر رب کو یاد کرنے کا مطلب، اس کی تسبیح و تحمید اور اس سے استغفار ہے۔

(۲) یعنی میں جس کا عزم ظاہر کر رہا ہوں، ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ بہتر اور مفید کام کی طرف میری رہنمائی فرمادے۔

(۳) جمہور مفسرین نے اسے اللہ کا قول قرار دیا ہے۔ شمسی حساب سے ۳۰۰ اور قمری حساب سے ۳۰۹ سال بنتے ہیں۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ انہی لوگوں کا قول ہے جو ان کی مختلف تعداد بتلاتے تھے، جس کی دلیل اللہ کا یہ قول ہے ”اللہ ہی کو ان کے ٹھہرے رہنے کی مدت کا بخوبی علم ہے“ جس کا مطلب وہ مذکورہ مدت کی نفی لیتے ہیں۔ لیکن جمہور کی تفسیر کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب یا کوئی اور، اس بتلائی ہوئی مدت سے اختلاف کرے، تو آپ ان سے کہہ دیں کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ جب اس نے تین سو نو سال مدت بتلائی ہے تو یہی صحیح ہے کیونکہ وہی جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت غار میں رہے؟

(۴) یہ اللہ کی صفت علم و خبری کی مزید وضاحت ہے۔

وَلَنْ نَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاوَةِ  
وَالْعِیْثِیِّ یُرِیْدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَیْنُکَ عَنْهُمْ  
تُرْبِیْدُ زَیْنَةَ الْحَیْوةِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تَطْعُمْ مَنْ آغْفَلْنَا  
قَلْبَهُ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعْهُ هَوْلَهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ۝

پڑھتا رہ،<sup>(۱)</sup> اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں تو اس کے سوا ہرگز ہرگز کوئی پناہ کی جگہ نہ پائے گا۔<sup>(۲)</sup> (۲۷)

اور اپنے آپ کو انہیں کے ساتھ رکھا کر جو اپنے پروردگار کو صبح شام پکارتے ہیں اور اسی کے چہرے کے ارادے رکھتے ہیں (رضامندی چاہتے ہیں) 'خبردار! تیری نگاہیں ان سے نہ ہٹنے پائیں<sup>(۳)</sup> کہ دنیوی زندگی کے ٹھاٹھ کے ارادے میں لگ جا۔<sup>(۴)</sup> دیکھ اس کا کہنا نہ مانا جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جس کا کام حد سے گزر چکا ہے۔<sup>(۵)</sup> (۲۸)

(۱) ویسے تو یہ حکم عام ہے کہ جس چیز کی بھی وحی آپ ﷺ کی طرف کی جائے، اس کی تلاوت فرمائیں اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں۔ لیکن اصحاب کف کے قصے کے خاتمے پر اس حکم سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصحاب کف کے بارے میں لوگ جو چاہیں، کہتے پھریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں اپنی کتاب میں جو کچھ اور جتنا کچھ بیان فرما دیا ہے، وہی صحیح ہے، وہی لوگوں کو پڑھ کر سنا دیجئے، اس سے زیادہ، دیگر باتوں کی طرف دھیان نہ دیجئے۔

(۲) یعنی اگر اسے بیان کرنے سے گریز و انحراف کیا، یا اس کے کلمات میں تغیر و تبدیلی کی کوشش کی، تو اللہ سے آپ کو بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ خطاب اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اصل مخاطب امت ہے۔

(۳) یہ وہی حکم ہے جو اس سے قبل سورۃ الأنعام، ۵۲ میں گزر چکا ہے۔ مراد ان سے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو غریب اور کمزور تھے، جن کے ساتھ بیٹھنا اشراف قریش کو گوارا نہ تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چھ آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، میرے علاوہ بلال، ابن مسعود، ایک ہڈی اور دو صحابہ رضی اللہ عنہم اور تھے۔ قریش مکہ نے خواہش ظاہر کی کہ ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو، تاکہ ہم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی بات سنیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں آیا کہ چلو شاید میری بات سننے سے ان کے دلوں کی دنیا بدل جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے منع فرما دیا (صحیح مسلم۔ فضائل الصحابة، باب فضل سعد بن ابی وقاص)

(۴) یعنی ان کو دور کر کے آپ اصحاب شرف و اہل غنی کو اپنے قریب کرنا چاہتے ہیں؟

(۵) فُرُطًا، اگر افراط سے ہو تو معنی ہوں گے حد سے متجاوز اور اگر تفریط سے ہو تو معنی ہوں گے کہ ان کا کام تفریط پر

مبنی ہے، جس کا نتیجہ ضیاع اور ہلاکت ہے۔

اور اعلان کر دے کہ یہ سراسر برحق قرآن تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ ظالموں کے لیے ہم نے وہ آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قاتیں انہیں گھیر لیں گی۔ اگر وہ فریاد رسی چاہیں گے تو ان کی فریاد رسی اس پانی سے کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہو گا جو چہرے بھون دے گا، بڑا ہی برا پانی ہے اور بڑی بری آرام گاہ (دوزخ) ہے۔ (۲۹)

یقیناً جو لوگ ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں تو ہم کسی نیک عمل کرنے والے کا ثواب ضائع نہیں کرتے۔<sup>(۱)</sup> (۳۰)

ان کے لیے ہمیشگی والی جنتیں ہیں، ان کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، وہاں یہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے<sup>(۲)</sup> اور سبز رنگ کے نرم و باریک اور موٹے ریشم کے لباس پہنیں گے،<sup>(۳)</sup> وہاں تختوں کے اوپر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے۔ کیا خوب بدلہ ہے، اور کس قدر عمدہ آرام گاہ ہے۔ (۳۱)

اور انہیں ان دو شخصوں کی مثال بھی سنادے<sup>(۴)</sup> جن میں

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِرْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهَا سُرَادِقُهَا وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا ۝

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ۝

أُولَئِكَ لَهُمْ جَنَّتٌ عَدْنٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَكُونَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَآئِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝

وَأَصْرِبُ لَهُمْ مَثَلًا زَكِّيَيْنَ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ

(۱) قرآن کے انداز بیان کے مطابق جنہیوں کے ذکر کے بعد اہل جنت کا تذکرہ ہے تاکہ لوگوں کے اندر جنت حاصل کرنے کا شوق و رغبت پیدا ہو۔

(۲) زمانہ نزول قرآن اور اس سے ما قبل رواج تھا کہ بادشاہ، رؤسا اور سرداران قبائل اپنے ہاتھوں میں سونے کے کڑے پہنتے تھے، جس سے ان کی امتیازی حیثیت نمایاں ہوتی تھی۔ اہل جنت کو بھی جنت میں کڑے پہنائے جائیں گے۔

(۳) سندس، باریک ریشم اور استبرق، موٹا ریشم۔ دنیا میں مردوں کے لیے سونا اور ریشمی لباس ممنوع ہیں، جو لوگ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے دنیا میں ان محرمات سے اجتناب کریں گے، انہیں جنت میں یہ ساری چیزیں میسر ہوں گی۔

وہاں کوئی چیز ممنوع نہیں ہوگی بلکہ اہل جنت جس چیز کی خواہش کریں گے، وہ موجود ہوگی۔ ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُوْنَ أَنْفُسُكُمْ﴾ ”جس چیز کو تمہارا جی چاہے اور جو کچھ تم مانگو سب جنت میں موجود ہے“

(۴) مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ دو شخص کون تھے؟ اللہ تعالیٰ نے تقسیم کے لیے بطور مثال ان کا تذکرہ کیا ہے

سے ایک کو ہم نے دو باغ انگوروں کے دے رکھے تھے اور جنہیں کھجوروں کے درختوں سے ہم نے گھیر رکھا<sup>(۱)</sup> تھا اور دونوں کے درمیان کھیتی لگا رکھی تھی۔<sup>(۲)</sup> (۳۲)

دونوں باغ اپنا پھل خوب لائے اور اس میں کسی طرح کی کمی نہ کی<sup>(۳)</sup> اور ہم نے ان باغوں کے درمیان نہر جاری کر رکھی تھی۔<sup>(۴)</sup> (۳۳)

الغرض اس کے پاس میوے تھے، ایک دن اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنے ساتھی<sup>(۵)</sup> سے کہا کہ میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور جتنے<sup>(۶)</sup> کے اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط ہوں۔ (۳۴)

اور یہ اپنے باغ میں گیا اور تھا اپنی جان پر ظلم کرنے والا۔ کہنے لگا کہ میں خیال نہیں کر سکتا کہ کسی وقت بھی یہ برباد ہو جائے۔ (۳۵)

اور نہ میں قیامت کو قائم ہونے والی خیال کرتا ہوں اور اگر (بالفرض) میں اپنے رب کی طرف لوٹا یا بھی گیا تو یقیناً

مِنْ أَعْنَابٍ وَخَفَضْنَاهُمْ يُسْخِلُ وَيَجْعَلْنَا بَيْنَهُمَا نَزْعًا ﴿۳۲﴾

كَلَّمَا الْجَنَّتَيْنِ اِنَّتِ اُكْلَهُمَا وَلَوْ نَبْغِي لَمِنْتَهُ سَيِّئًا وَفَجَّرْنَا خِلْفَهُمَا نَهْرًا ﴿۳۳﴾

وَكَانَ لَهُ شَمْرٌ فَتَالَ لِمَصَاحِبِهِ وَهُوَ يَحْدُو رَا اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَاَعَزُّ نَفْرًا ﴿۳۴﴾

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا اَظُنُّ اَنْ يَّبِيدَ هٰذِهِ اَبَدًا ﴿۳۵﴾

وَمَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَاَلَيْنُ لِيُؤَدِّتْ اِلٰى رَبِّي لَكِيْدًا

یا واقعی دو شخص ایسے تھے؟ اگر تھے تو یہ بنی اسرائیل میں گزرے ہیں یا اہل مکہ میں سے تھے، ان میں ایک مؤمن اور دوسرا کافر تھا۔

(۱) جس طرح چار دیواری کے ذریعے سے حفاظت کی جاتی ہے، اس طرح ان باغوں کے چاروں طرف کھجوروں کے درخت تھے، جو باڑ اور چار دیواری کا کام دیتے تھے۔

(۲) یعنی دونوں باغوں کے درمیان کھیتی تھی جن سے غلہ جات کی فصلیں حاصل کی جاتی تھیں۔ یوں دونوں باغ غلے اور میووں کے جامع تھے۔

(۳) یعنی اپنی پیداوار میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے بلکہ بھرپور پیداوار دیتے تھے۔

(۴) تاکہ باغوں کو سیراب کرنے میں کوئی انقطاع واقع نہ ہو۔ یا بارانی علاقوں کی طرح بارش کے محتاج نہ رہیں۔

(۵) یعنی باغوں کے مالک نے، جو کافر تھا، اپنے ساتھی سے کہا جو مؤمن تھا۔

(۶) نَفْرٌ (جتنے) سے مراد اولاد اور نوکر چاکر ہیں۔

خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

میں (اس لوٹنے کی جگہ) اس سے بھی زیادہ <sup>(۱)</sup> بہتر  
پاؤں گا۔ (۳۶)

اس کے ساتھی نے اس سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ کیا  
تو اس (معبود) سے کفر کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا  
کیا۔ پھر نطفے سے پھر تجھے پورا آدمی بنا دیا۔ <sup>(۲)</sup> (۳۷)

لیکن میں تو عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار  
ہے میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروں  
گا۔ <sup>(۳)</sup> (۳۸)

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي  
خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾

لَكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ﴿۳۸﴾

(۱) یعنی وہ کافر عجب اور غرور میں ہی مبتلا نہیں ہوا بلکہ اس کی مدہوشی اور مستقبل کی حسین اور لمبی امیدوں نے اسے  
اللہ کی گرفت اور مکافات عمل سے بالکل غافل کر دیا۔ علاوہ ازیں اس نے قیامت کا ہی انکار کر دیا، پھر ڈھٹائی کا مظاہرہ  
کرتے ہوئے کہا کہ اگر قیامت برپا ہوئی بھی تو وہاں بھی حسن انجام میرا مقدر ہو گا۔ جن کافرو طغیان حد سے تجاوز کر جاتا  
ہے، وہ مست مئے پندار ہو کر ایسے ہی متکبرانہ دعوے کرتے ہیں۔ جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَلَكِنَّ زُجُجَتِ  
إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ رَبِّيٰ عِنْدَهُ لَلْخُشْيٰى﴾ (حلم السجدة: ۵۰) ”اگر مجھے رب کی طرف لوٹنا گیا تو وہاں بھی میرے لیے اچھائیاں  
ہی ہیں۔“ ﴿أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتِيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا﴾ (مریم: ۷۷) ”کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے  
ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کیا اور دعویٰ کیا کہ آخرت میں بھی مجھے مال و اولاد سے نوازا جائے گا۔“

(۲) اس کی یہ باتیں سن کر اس کے مومن ساتھی نے اس کو وعظ و تبلیغ کے انداز میں سمجھایا کہ تو اپنے خالق کے ساتھ  
کفر کا ارتکاب کر رہا ہے، جس نے تجھے مٹی اور قطرہ پانی (مٹی) سے پیدا کیا۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام چونکہ مٹی  
سے بنائے گئے تھے، اس لیے انسانوں کی اصل مٹی ہی ہوئی۔ پھر قرہی سب وہ نطفہ بنا جو باپ کی صلب سے نکل کر رحم  
مادر میں گیا، وہاں نوسینے اس کی پرورش کی۔ پھر اسے پورا انسان بنا کر ماں کے پیٹ سے نکالا۔ بعض کے نزدیک مٹی سے  
پیدا ہونے کا مطلب ہے کہ انسان جو خوراک کھاتا ہے، وہ سب زمین سے یعنی مٹی سے ہی حاصل ہوتی ہے، اسی  
خوراک سے وہ نطفہ بنتا ہے جو عورت کے رحم میں جا کر انسان کی پیدائش کا ذریعہ بنتا ہے۔ یوں بھی ہر انسان کی اصل  
مٹی ہی قرار پاتی ہے۔ ناشکرے انسان کو اس کی اصل یاد دلا کر اسے اس کے خالق اور رب کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے  
کہ تو اپنی حقیقت اور اصل پر غور کر، اور پھر رب کے ان احسانات کو دیکھ، کہ تجھے اس نے کیا کچھ بنا دیا اور اس عمل  
تخلیق میں کوئی اس کا شریک اور مددگار نہیں ہے، یہ سب کچھ کرنے والا صرف اور صرف وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس کو  
ماننے کے لیے توتیار نہیں ہے۔ آہ، کس قدر یہ انسان ناشکر ہے؟

(۳) یعنی میں تیری طرح کی بات نہیں کروں گا بلکہ میں تو اللہ کی ربوبیت اور اس کی وحدانیت کا اقرار و اعتراف کرتا

تو نے اپنے باغ میں جاتے وقت کیوں نہ کہا کہ اللہ کا چاہا ہونے والا ہے، کوئی طاقت نہیں مگر اللہ کی مدد<sup>(۱)</sup> سے، اگر تو مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کم دیکھ رہا ہے۔ (۳۹) بہت ممکن ہے کہ میرا رب مجھے تیرے اس باغ سے بھی بہتر دے<sup>(۲)</sup> اور اس پر آسمانی عذاب بھیج دے تو یہ چٹیل اور چکنا میدان بن جائے۔<sup>(۳)</sup> (۴۰) یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تیرے بس میں نہ رہے کہ تو اسے ڈھونڈھ لائے۔<sup>(۴)</sup> (۴۱) اور اس کے (سارے) پھل گھیر لیے گئے،<sup>(۵)</sup> پس وہ اپنے اس خرچ پر جو اس نے اس میں کیا تھا اپنے ہاتھ ملنے<sup>(۶)</sup> لگا اور وہ باغ تو اوندھا لٹا پڑا تھا<sup>(۷)</sup> اور (وہ شخص) یہ کہہ

وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ  
إِنْ تَرَىٰ أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَوَلَدًا ﴿۳۹﴾

فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُؤْتِيَنِي خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ  
عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحُ صَعِيدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾

أَوْ يُصِيبُكَ مَاءٌ مَّا عَوْرًا فَمَنْ تَتَّبِعُهُ لَهْ كَلْبًا ﴿۴۱﴾

وَأُحِيطَ بِشَمْرِهِ فَاصْبِرْ يُقَالُ يُقَالِبُ كَفَيْهِ عَلَىٰ مَا أَنْفَقَ فِيهَا  
وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَلَيْتَنِي

ہوں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا ساتھی مشرک ہی تھا۔

(۱) اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا طریقہ بتلاتے ہوئے کہا کہ باغ میں داخل ہوتے وقت سرکشی اور غرور کا مظاہرہ کرنے کے بجائے یہ کہا ہوتا، مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ یعنی جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے، وہ چاہے تو اسے باقی رکھے اور چاہے تو فنا کر دے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ جس کو کسی کا مال، اولاد یا حال اچھا لگے تو اسے مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ پڑھنا چاہیے۔ (تفسیر ابن کثیر۔ بحوالہ مسند أبویعلیٰ)

(۲) دنیا میں یا آخرت میں۔ یا دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں۔

(۳) حُسْبَانًا، غُفْرَانًا کے وزن پر۔ حساب سے ہے یعنی ایسا عذاب، جو کسی کے کرتوتوں کے نتیجے میں آئے۔ یعنی آسمانی عذاب کے ذریعے سے وہ محاسبہ کر لے۔ اور یہ جگہ جہاں اس وقت سرسبز و شاداب باغ ہے، چٹیل اور چکنا میدان بن جائے۔

(۴) یاد درمیان میں جو نہر ہے جو باغ کی شادابی اور زرخیزی کا باعث ہے، اس کے پانی کو اتنا گہرا کر دے کہ اس سے پانی کا حصول ہی ناممکن ہو جائے۔ اور جہاں پانی زیادہ گہرائی میں چلا جائے تو پھر وہاں بڑے بڑے ہارس پاور کی موٹریں اور مشینیں بھی پانی کو اوپر کھینچ لانے میں ناکام رہتی ہیں۔

(۵) یہ کنایہ ہے ہلاکت و فنا سے۔ یعنی اس کا سارا باغ ہلاک کر ڈالا گیا۔

(۶) یعنی باغ کی تعمیر و اصلاح اور کاشت کاری کے اخراجات پر کف افسوس ملنے لگا۔ ہاتھ ملنا کنایہ ہے ندامت سے۔

(۷) یعنی جن چھتوں، چھروں پر انگوروں کی بیلےں تھیں، وہ سب زمین پر آ رہیں اور انگوروں کی ساری فصل تباہ ہو گئی۔

رہا تھا کہ کاش! میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرتا۔<sup>(۱)</sup> (۴۲)

اس کی حمایت میں کوئی جماعت نہ<sup>(۲)</sup> اٹھی کہ اللہ سے اس کا کوئی بچاؤ کرتی اور نہ وہ خود ہی بدلہ لینے والا بن سکا۔ (۴۳)

یہیں سے (ثابت ہے) کہ اختیارات<sup>(۳)</sup> اللہ برحق کے لیے ہیں وہ ثواب دینے اور انجام کے اعتبار سے بہت<sup>(۴)</sup> ہی بہتر ہے۔ (۴۴)

ان کے سامنے دنیا کی زندگی کی مثال (بھی) بیان کرو جیسے پانی جسے ہم آسمان سے اتارتے ہیں اس سے زمین کا سبزہ ملا جلا (نکلا) ہے، پھر آخر کار وہ چورا چورا ہو جاتا ہے جسے ہوائیں اڑائے لیے پھرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔<sup>(۵)</sup> (۴۵)

لَمْ أَشْرِكْ بِرَبِّيَ أَحَدًا ۝

وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِتْنَةٌ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ  
وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا ۝

هَذَلِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا  
وَخَيْرٌ عُقْبًا ۝

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا آتَيْنَاهُ  
مِنَ السَّمَاءِ فَآخَذَتْ بِهِنَّ نَبَاتٌ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ  
هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيحُ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ  
مُقْتَدِرًا ۝

(۱) اب اسے احساس ہوا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اس کی نعمتوں سے فیض یاب ہو کر اس کے احکام کا انکار کرنا اور اس کے مقابلے میں سرکشی، کسی طرح بھی ایک انسان کے لیے زیبا نہیں، لیکن اب حسرت و افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اب پچھتائے کیا ہوت، جب چیزیاں چگ گئیں نہایت۔

(۲) جس جتنے پر اس کو ناز تھا، وہ بھی اس کے کام نہیں آیا نہ وہ خود ہی اللہ کے عذاب سے بچنے کا کوئی انتظام کر سکا۔

(۳) وَلَايَةُ کے معنی موالات اور نصرت کے ہیں، یعنی اس مقام پر ہر مومن و کافر کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کسی کی مدد کرنے پر اور اس کے عذاب سے بچانے پر قادر نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ پھر اس موقع پر بڑے بڑے سرکش اور جبار بھی اظہار ایمان پر مجبور ہو جاتے ہیں، گو اس وقت کا ایمان نافع اور مقبول نہیں۔ جس طرح قرآن نے فرعون کی بابت نقل کیا ہے کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو کہنے لگا، ﴿ اٰمَنْتُ اِنَّهُ لَرٰلِهُ اِلَّا الَّذِیْ اٰمَنْتُ بِهٖ بُنُوْاۤ اٰسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴾ (سورۃ یونس، ۹۰) ”میں اس اللہ پر ایمان لایا جس پر بنو اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔“ دوسرے کفار کی بابت فرمایا گیا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا، ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور جن کو ہم اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے، ان کا انکار کرتے ہیں“ (سورۃ المؤمن، ۸۴) اگر ولایت، واؤ کے کسرے کے ساتھ ہو تو پھر اس کے معنی حکم اور اختیارات کے ہیں، جیسا کہ ترجمے میں یہی معنی اختیار کیے گئے ہیں (ابن کثیر)

(۴) یعنی وہی اپنے دوستوں کو بہتر بدلہ دینے والا اور حسن عاقبت سے مشرف کرنے والا ہے۔

(۵) اس آیت میں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو کھیتی کی ایک مثال کے ذریعے سے واضح کیا گیا ہے کہ کھیتی میں لگے

مال و اولاد تو دنیا کی ہی زینت ہے،<sup>(۱)</sup> اور (ہاں) البتہ باقی رہنے والی نیکیاں<sup>(۲)</sup> تیرے رب کے نزدیک ازروئے ثواب اور (آئندہ کی) اچھی توقع کے بہت بہتر ہیں۔ (۳۶)  
 اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے<sup>(۳)</sup> اور زمین کو تو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا اور تمام لوگوں کو ہم اکٹھا کریں گے ان میں سے ایک کو بھی باقی نہ چھوڑیں گے۔<sup>(۴)</sup> (۳۷)

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَةُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرًا أَمْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَاتٌ أَنْ يَسُبُّوا الْجِبَالَ وَيُرْوُوا مِنَ الْأَرْضِ يَأْرِزُوا وَظَنُّهُمْ فَلَمْ يَنْصُرُوا مِنْهُمْ أَحَدًا ﴿۳۷﴾

ہوئے پودوں اور درختوں پر جب آسمان سے بارش برستی ہے تو پانی سے مل کر کھیتی لہلہا اٹھتی ہے، پودے اور درخت حیات نو سے شاداب ہو جاتے ہیں۔ لیکن پھر ایک وقت آتا ہے کہ کھیتی سوکھ جاتی ہے۔ پانی کے عدم دستیابی کی وجہ سے یا فصل پک جانے کے سبب۔ تو پھر ہوائیں اس کو اڑائے پھرتی ہیں۔ ہوا کا ایک جھونکا کبھی اسے دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب جھکا دیتا ہے۔ دنیا کی زندگی بھی ہوا کے ایک جھونکے یا پانی کے بلبلے یا کھیتی ہی کی طرح ہے، جو اپنی چند روزہ بہار دکھا کر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ اور یہ سارے تصرفات اس ہستی کے ہاتھ میں ہیں جو ایک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی یہ مثال قرآن مجید میں متعدد جگہ بیان فرمائی ہے۔ (مثلاً سورہ یونس، ۲۵، سورہ زمر، ۲۱، سورہ حدید، ۵۰ وغیرہ من الآیات۔)

(۱) اس میں ان اہل دنیا کا رد ہے جو دنیا کے مال و اسباب، قبیلہ و خاندان اور آل اولاد پر فخر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یہ چیزیں تو دنیائے فانی کی عارضی زینت ہیں۔ آخرت میں یہ چیزیں کچھ کام نہیں آئیں گی۔ اسی لیے اس سے آگے فرمایا کہ آخرت میں کام آنے والے عمل تو وہ ہیں جو باقی رہنے والے ہیں۔

(۲) باقیات صالحات (باقی رہنے والی نیکیاں) کون سی یا کون کون سی ہیں؟ کسی نے نماز کو، کسی نے تحمید و تسبیح اور تکبیر و تہلیل کو اور کسی نے بعض اور اعمال خیر کو اس کا مصداق قرار دیا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ عام ہے اور تمام نیکیوں کو شامل ہے۔ تمام فرائض و واجبات اور سنن و نوافل سب باقیات صالحات ہیں بلکہ منہیات سے اجتناب بھی ایک عمل صالح ہے، جس پر عند اللہ اجر و ثواب کی امید ہے۔

(۳) یہ قیامت کی ہولناکیوں اور بڑے بڑے واقعات کا بیان ہے۔ پہاڑوں کو چلائیں گے کا مطلب، پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے اور دھنی ہوئی روٹی کی طرح اڑ جائیں گے۔ ﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ — (القارعة ۵۰) ”اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھکی ہوئی رنگین اون“ مزید دیکھئے سورہ طور، ۹، ۱۰، سورہ نمل، ۸۸، سورہ طہ، ۱۰۵، ۱۰۷۔ زمین سے جب پہاڑ جیسی مضبوط چیزیں ختم ہو جائیں گی، تو مکانات، درخت اور اسی طرح کی دیگر چیزیں کس طرح اپنا وجود برقرار رکھ سکیں گی؟ اسی لیے آگے فرمایا ”تو زمین کو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا۔“

(۴) یعنی اولین و آخرین، چھوٹے بڑے، کافر و مؤمن سب کو جمع کریں گے، کوئی زمین کی تہ میں پڑا نہ رہ جائے گا اور نہ قبر سے نکل کر کسی جگہ چھپ سکے گا۔

(۱) اور سب کے سب تیرے رب کے سامنے صف بستہ  
حاضر کیے جائیں گے۔ یقیناً تم ہمارے پاس اسی طرح آئے  
جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا لیکن تم تو  
اسی خیال میں رہے کہ ہم ہرگز تمہارے لیے کوئی  
وعدے کا وقت مقرر کریں گے بھی نہیں۔ (۳۸)

اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیئے جائیں گے۔ پس تو دیکھے  
گا کہ گنہگار اس کی تحریر سے خوفزدہ ہو رہے ہوں گے  
اور کہہ رہے ہوں گے ہائے ہماری خرابی یہ کیسی کتاب  
ہے جس نے کوئی چھوٹا بڑا بغیر گھیرے کے باقی ہی نہیں  
چھوڑا، اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے  
اور تیرا رب کسی پر ظلم و ستم نہ کرے گا۔ (۳۹)

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو  
ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، یہ جنوں میں سے تھا،<sup>(۲)</sup>  
اس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی،<sup>(۳)</sup> کیا پھر بھی تم

وَعَرَضُوا عَلٰی رَبِّكَ صَافًا لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ  
اَوَّلَ مَرَّةٍ نَّبَلْ زَعْمُهُمْ اَلَنْ نَجْعَلَ لَكُمْ مَوْعِدًا ﴿۳۸﴾

وَوَضِعَ الْكِتٰبَ فَتَرٰى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ  
مَتَّافِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَا لَ هٰذَا الْكِتٰبِ  
لَا يَخَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا وَّوَجَدُوْا  
مَا عَمِلُوْا حٰضِرًا وَّلَا يَظْلِمُوْا رَبَّكَ اَحَدًا ﴿۳۹﴾

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا  
اِلَّا اِبْلٰسَ كَانَ مِنَ الْجٰنِ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ

(۱) اس کے معنی ہیں کہ ایک ہی صف میں اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے، یا صفوں کی شکل میں بارگاہ الہی میں  
حاضر ہوں گے۔

(۲) قرآن کی اس صراحت نے واضح کر دیا کہ شیطان فرشتہ نہیں تھا، فرشتہ اگر ہوتا تو حکم الہی سے سرتابی کی اسے مجال  
ہی نہ ہوتی، کیونکہ فرشتوں کی صفت اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے کہ ﴿لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُوْمَرُوْنَ﴾  
(الاحزاب: ۱۰) ”وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔“ اس صورت میں  
یہ اشکال رہتا ہے، اگر وہ فرشتہ نہیں تھا تو پھر اللہ کے حکم کا وہ مخاطب ہی نہیں تھا، کیونکہ اس کے مخاطب تو فرشتے تھے،  
انہیں کو سجدے کا حکم دیا گیا تھا، صاحب روح المعانی نے کہا ہے کہ وہ فرشتہ یقیناً نہیں تھا، لیکن وہ فرشتوں کے ساتھ ہی  
رہتا تھا اور ان ہی میں شمار ہوتا تھا، اس لیے وہ بھی اسجدوا لادَم کے حکم کا مخاطب تھا۔ اور سجدہ آدم کے حکم کے ساتھ  
اس کا مخاطب کیا جانا قطعاً ہے۔ ارشاد باری ہے ﴿مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اُمِرْتَ﴾ ”جب میں نے تجھے حکم دے دیا تو پھر تو  
نے سجدہ کیوں نہ کیا۔“

(۳) فسق کے معنی ہوتے ہیں نکلنا، چوہا جب اپنے بل سے نکلتا ہے تو کہتے ہیں فسقت الفأرة من جحرها شیطان  
بھی سجدہ تعظیم و تحیہ کا انکار کر کے رب کی اطاعت سے نکل گیا۔

اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا دوست بنا رہے ہو؟ حالانکہ وہ تم سب کا دشمن ہے۔<sup>(۱)</sup> ایسے ظالموں کا کیا ہی برابر ہے۔<sup>(۲)</sup> (۵۰)

میں نے انہیں آسمانوں و زمین کی پیدائش کے وقت موجود نہیں رکھا تھا اور نہ خود ان کی اپنی پیدائش میں،<sup>(۳)</sup> اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنانے والا بھی نہیں۔<sup>(۴)</sup> (۵۱)

اور جس دن وہ فرمائے گا کہ تمہارے خیال میں جو میرے شریک تھے انہیں پکارو یا یہ پکاریں گے لیکن ان میں سے کوئی بھی جواب نہ دے گا ہم ان کے درمیان ہلاکت کا سامان کر دیں گے۔<sup>(۵)</sup> (۵۲)

أَفَتَتَّخِذُونَہٗ وَذُرِّيَّتَہٗٓ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِہُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِمَنْ لِّلظَّالِمِينَ بَدَلًا ۝

مَا أَشْهَدُہُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِہُمْ وَمَا كُنْتَ مُنْتَضِدًا مِّنْهُم مَّضِلِّينَ عَضُدًا ۝

وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَآئِيَ الَّذِيْنَ رَعَبْتُمْ فَدَعَوْہُمْ فَلَمْ يَسْتَجِیْبُوْا لَہُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَہُمْ مَّوْبِقًا ۝

(۱) یعنی کیا تمہارے لیے یہ صحیح ہے کہ تم ایسے شخص کو اور اس کی ذریت کو دوست بناؤ جو تمہارے باپ آدم علیہ السلام کا دشمن، تمہارا دشمن اور تمہارے رب کا دشمن ہے اور اللہ کو چھوڑ کر اس شیطان کی اطاعت کرو؟

(۲) ایک دوسرا ترجمہ اس کا یہ کیا گیا ہے ”ظالموں نے کیا ہی برابر اختیار کیا ہے۔“ یعنی اللہ کی اطاعت اور اسکی دوستی کو چھوڑ کر شیطان کی اطاعت اور اسکی دوستی جو اختیار کی ہے تو یہ بہت ہی برابر ہے، جسے ان ظالموں نے اپنایا ہے۔

(۳) یعنی آسمان و زمین کی پیدائش اور اس کی تدبیر میں، بلکہ خود ان شیاطین کی پیدائش میں ہم نے ان سے یا ان میں سے کسی ایک سے کوئی مدد حاصل نہیں کی، یہ تو اس وقت موجود بھی نہیں تھے۔ پھر تم اس شیطان اور اس کی ذریت کی پوجا یا ان کی اطاعت کیوں کرتے ہو؟ اور میری عبادت و اطاعت سے تمہیں گریز کیوں ہے؟ جب کہ یہ مخلوق ہیں اور میں ان سب کا خالق ہوں۔

(۴) اور بفرض محال اگر میں کسی کو مددگار بناتا بھی تو ان کو کیسے بناتا، جب کہ یہ میرے بندوں کو گمراہ کر کے میری جنت اور میری رضا سے روکتے ہیں۔

(۵) مَوْبِقٌ کے ایک معنی حجاب (پردے اور آڑ) کے ہیں۔ یعنی ان کے درمیان پردہ اور فاصلہ کر دیا جائے گا، کیونکہ ان کے مابین آپس میں عداوت ہوگی۔ نیز اس لیے کہ عرصہ محشر میں یہ ایک دوسرے کو نہ مل سکیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ جہنم میں پیپ اور خون کی مخصوص وادی ہے۔ اور بعض نے اس کا ترجمہ ملک کیا ہے جیسا کہ ترجمے سے واضح ہے یعنی یہ مشرک اور ان کے مزعومہ معبود، یہ ایک دوسرے کو مل ہی نہیں سکیں گے کیوں کہ ان کے درمیان ہلاکت کا سامان اور ہولناک چیزیں ہوں گی۔

اور گنہگار جنم کو دیکھ کر سمجھ لیں گے کہ وہ اسی میں  
جھونکے جانے والے ہیں لیکن اس سے بچنے کی جگہ نہ  
پائیں گے۔<sup>(۱)</sup> (۵۳)

ہم نے اس قرآن میں ہر ہر طریقے سے تمام کی تمام  
مثالیں لوگوں کے لیے بیان کر دی ہیں لیکن انسان سب  
سے زیادہ جھگڑالو ہے۔<sup>(۲)</sup> (۵۴)

لوگوں کے پاس ہدایت آچکنے کے بعد انہیں ایمان لانے اور  
اپنے رب سے استغفار کرنے سے صرف اسی چیز نے روکا  
کہ اگلے لوگوں کا معاملہ انہیں بھی پیش آئے<sup>(۳)</sup> یا ان  
کے سامنے کھلم کھلا عذاب آمو جو ہو جائے۔<sup>(۴)</sup> (۵۵)

ہم تو اپنے رسولوں کو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ وہ  
خوشخبریاں سنا دیں اور ڈرا دیں۔ کافر لوگ باطل کے  
سارے جھگڑتے ہیں اور (چاہتے ہیں کہ) اس سے حق کو  
لڑکھڑادیں، انہوں نے میری آیتوں کو اور جس چیز سے  
ڈرایا جائے اسے مذاق بنا ڈالا ہے۔<sup>(۵)</sup> (۵۶)

اس نے بڑھ کر ظالم کون ہے؟ جسے اس کے رب کی  
آیتوں سے نصیحت کی جائے وہ پھر بھی منہ موڑے رہے

وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاعِنُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا  
عَنْهَا مَصْرِفًا ۝

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ  
وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرُ شَيْءٍ جَدَلًا ۝

وَمَا مَنَعَهُ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا  
رَبَّهُمْ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمْ سُنَّةٌ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ  
الْعَذَابُ قُبُلًا ۝

وَمَا تُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ  
وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا  
بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوا آلِيئَتِي وَمَا أَنْذَرُوا ۝

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا  
وَلَيْسَ بِأَقْدَمَ يَدَاؤُنَا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً

(۱) جس طرح بعض روایات میں ہے کہ کافر بھی چالیس سال کی مسافت پر ہو گا کہ یقین کر لے گا کہ جنم ہی اس کا ٹھکانا  
ہے (مسند احمد، جلد ۳، ص ۷۵)

(۲) یعنی ہم نے انسانوں کو حق کا راستہ سمجھانے کے لیے قرآن میں ہر طریقہ استعمال کیا ہے، وعظ و تذکیر، امثال و  
واقعات اور دلائل و براہین، علاوہ ازیں انہیں بار بار اور مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ لیکن انسان چونکہ سخت جھگڑالو  
ہے، اس لیے وعظ و نصیحت کا اس پر اثر ہوتا ہے اور نہ دلائل و براہین اس کے لیے کارگر۔

(۳) یعنی تکذیب کی صورت میں ان پر بھی اسی طرح عذاب آئے، جیسے پہلے لوگوں پر آیا۔

(۴) یعنی یہ اہل مکہ ایمان لانے کے لیے ان دو باتوں میں سے کسی ایک کے منتظر ہیں۔ لیکن ان عقل کے اندھوں کو یہ  
پتہ نہیں کہ اس کے بعد ایمان کی کوئی حیثیت ہی نہیں یا اس کے بعد ایمان لانے کا ان کو موقع ہی کب ملے گا؟

(۵) اور اللہ کی آیتوں کا مذاق اڑانا، یہ تکذیب کی بدترین قسم ہے۔ اسی طرح جدال بالباطل کے ذریعے سے (یعنی باطل

اور جو کچھ اس کے ہاتھوں نے آگے بھیج رکھا ہے اسے بھول جائے، بیشک ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اسے (نہ) سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی ہے، گو تو انہیں ہدایت کی طرف بلاتا رہے، لیکن یہ کبھی بھی ہدایت نہیں پانے<sup>(۱)</sup> کے۔ (۵۷)

تیرا پروردگار بہت ہی بخشش والا اور مہربانی والا ہے وہ اگر ان کے اعمال کی سزا میں پکڑے تو بیشک انہیں جلد ہی عذاب کر دے، بلکہ ان کے لیے ایک وعدہ کی گھڑی مقرر ہے جس سے وہ سرکنے کی ہرگز جگہ نہیں پائیں گے۔<sup>(۲)</sup> (۵۸)

یہ ہیں وہ بستیاں جنہیں ہم نے ان کے مظالم کی بنا پر غارت کر دیا اور ان کی تباہی کی بھی ہم نے ایک میعاد

أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِنْ تَدْعُهُمْ  
إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يُهْتَدُوا إِذَا أَبَدًا ۝

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوا  
لَعَجَلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ابْتِغَاءَ لِقَاءِ رَبِّهِمْ لَئِنْ يَجِدُوا  
مِنْ دُونِهِ مَوْجِلًا ۝

وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَوْجِدًا ۝

طریقے اختیار کر کے) حق کو باطل ثابت کرنے کی سعی کرنا بھی نہایت مذموم حرکت ہے۔ اسی مجادلہ بالباطل کی ایک صورت یہ ہے جو کافر رسولوں کو یہ کہہ کر ان کی رسالت کا انکار کر دیتے رہے کہ تم تو ہمارے جیسے ہی انسان ہو ﴿مَا آتَانَا﴾ (الاکسہ - ۱۵) ہم تمہیں رسول کس طرح تسلیم کر لیں؟ دَحَضَ کے اصل معنی پھسلنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے دَحَضَتْ رَجُلُهُ (اس کا پیر پھسل گیا) یہاں سے یہ کسی چیز کے زوال (ٹلنے) اور بطلان کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کہتے ہیں۔ دَحَضَتْ حُجَّتُهُ دُحُوضًا أَي بَطَلَتْ (اس کی حجت باطل ہو گئی) اس لحاظ سے أَدْحَضَ يَدْحِضُ کے معنی ہوں گے باطل کرنا (فتح القدير)

(۱) یعنی ان کے اس ظلم عظیم کی وجہ سے کہ انہوں نے رب کی آیات سے اعراض کیا اور اپنے کرتوتوں کو بھولے رہے، ان کے دلوں پر ایسے پردے اور ان کے کانوں پر ایسے بوجھ ڈال دیئے گئے ہیں، جس سے قرآن کا سمجھنا، سنا اور اس سے ہدایت قبول کرنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ ان کو کتنا بھی ہدایت کی طرف بلاؤ، یہ کبھی بھی ہدایت کا راستہ اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

(۲) یعنی یہ تو رب غفور کی رحمت ہے کہ وہ گناہ پر فوراً گرفت نہیں فرماتا، بلکہ مہلت دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پاداش عمل میں ہر شخص ہی عذاب الہی کے شکنجے میں کسا ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے اور ہلاکت کا وہ وقت آ جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ مقرر کئے ہوتا ہے تو پھر فرار کا کوئی راستہ اور بچاؤ کی کوئی سبیل ان کے لیے نہیں رہتی۔ مَوْنِلٌ کے معنی ہیں جائے پناہ، راہ فرار۔

مقرر کر رکھی تھی۔<sup>(۱)</sup> (۵۹)

جبکہ موسیٰ نے اپنے نوجوان<sup>(۲)</sup> سے کہا کہ میں تو چلتا ہی رہوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے<sup>(۳)</sup> سنگم پر پہنچوں، خواہ مجھے سالہا سال چلنا پڑے۔<sup>(۴)</sup> (۶۰)

جب وہ دونوں دریا کے سنگم پر پہنچے، وہاں اپنی مچھلی بھول گئے جس نے دریا میں سرنگ جیسا اپنا راستہ بنا لیا۔ (۶۱)

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ۝

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنَهُمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخِذَا سَبِيلَهُ فِي الْبَعْرِ رِجًا ۝

(۱) اس سے مراد، عاد ثمود اور حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام وغیرہ کی قومیں ہیں جو اہل حجاز کے قریب اور ان کے راستوں میں ہی تھیں۔ انہیں بھی اگرچہ ان کے ظلم کے سبب ہی ہلاک کیا گیا لیکن ہلاکت سے پہلے انہیں پورا موقع دیا گیا اور جب یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کا ظلم و طغیان اس حد کو پہنچ گیا ہے، جہاں سے ہدایت کے راستے بالکل مسدود ہو جاتے ہیں اور ان سے خیر اور بھلائی کی امید باقی نہیں رہی، تو پھر ان کی مہلت عمل ختم اور تباہی کا وقت شروع ہو گیا۔ پھر انہیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ یا اہل دنیا کے لیے عبرت کا نمونہ بنا دیا گیا۔ یہ دراصل اہل مکہ کو سمجھایا جا رہا ہے کہ تم ہمارے آخری پیغمبر اور اشرف المرسل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر رہے ہو، تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں جو مہلت مل رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں بلکہ یہ مہلت تو سنت اللہ ہے جو ایک وقت موعود تک ہر فرد، گروہ اور قوم کو وہ عطا کرتا ہے۔ جب یہ مدت ختم ہو جائے گی اور تم اپنے کفر و عناد سے باز نہیں آؤ گے تو پھر تمہارا حشر بھی اس سے مختلف نہیں ہو گا جو تم سے پہلی قوموں کا ہو چکا ہے۔

(۲) نوجوان سے مراد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے۔

(۳) اس مقام کی تعیین کسی یقینی ذریعہ سے نہیں ہو سکی ہے تاہم قرآن کا اقتضایہ ہے کہ اس سے مراد صحرائے سینا کا وہ جنوبی راس ہے جہاں خلیج عقبہ اور خلیج سویس دونوں آکر ملتے اور بحر احمر میں ضم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے مقامات جن کا ذکر مفسرین نے کیا ہے ان پر سرے سے مجمع البحرین کی تعبیر ہی صادق نہیں آتی۔

(۴) حُقُب کے ایک معنی ۵۰ یا ۸۰ سال اور دوسرے معنی غیر معین مدت کے ہیں۔ یہاں یہی دو سراسر معنی مراد ہے۔ یعنی جب تک میں مجمع البحرین (جہاں دونوں سمندر ملتے ہیں) نہیں پہنچ جاؤں گا، چلتا رہوں گا اور سفر جاری رکھوں گا، چاہے کتنا بھی عرصہ لگ جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس سفر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انہوں نے ایک موقع پر ایک سائل کے جواب میں یہ کہہ دیا کہ اس وقت مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ جملہ پسند نہیں آیا اور وحی کے ذریعے سے انہیں مطلع کیا کہ ہمارا ایک بندہ (خضر) ہے جو تجھ سے بھی بڑا عالم ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ یا اللہ اس سے ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جہاں دونوں سمندر ملتے ہیں، وہیں ہمارا وہ

جب یہ دونوں وہاں سے آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے نوجوان سے کہا کہ لاہارا کھانا دے ہمیں تو اپنے اس سفر سے سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ (۶۲)

اس نے جواب دیا کہ کیا آپ نے دیکھا بھی؟ جبکہ ہم پتھر سے ٹیک لگا کر آرام کر رہے تھے وہیں میں مچھلی بھول گیا تھا، دراصل شیطان نے ہی مجھے بھلا دیا کہ میں آپ سے اس کا ذکر کروں۔ اس مچھلی نے ایک انوکھے طور پر دریا<sup>(۱)</sup> میں اپنا راستہ بنا لیا۔ (۶۳)

موسیٰ نے کہا یہی تھا جس کی تلاش میں ہم تھے چنانچہ وہیں سے اپنے قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے واپس<sup>(۲)</sup> لوٹے۔ (۶۴)

پس ہمارے بندوں میں سے ایک بندے<sup>(۳)</sup> کو پایا، جسے

فَلَمَّا جَاؤَا قَالِ لِقَتْلِهِ إِنَّمَا عَدَاؤُنَا لِقَدْلَقَيْنَا مِنْ سَفَرِنَا  
هَذَا نَصَبًا ۝۱۵

قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحَوْتَ  
وَمَا أَتَسْمِينَهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَاتَّخَذَ سَيِّدَهُ  
فِي الْبَعْرِ جَهْبًا ۝۱۶

قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغُ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا ۝۱۷

فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا آتَيْنَهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ

بندہ بھی ہو گا۔ نیز فرمایا کہ مچھلی ساتھ لے جاؤ، جہاں مچھلی تمہاری نوکری (زئیل) سے نکل کر غائب ہو جائے تو سمجھ لینا کہ یہی مقام ہے (بخاری، سورہ کف) چنانچہ اس حکم کے مطابق انہوں نے ایک مچھلی لی اور سفر شروع کر دیا۔

(۱) یعنی مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سمندر میں سرنگ کی طرح راستہ بنا دیا۔ حضرت یوشع علیہ السلام نے مچھلی کو سمندر میں جاتے اور راستہ بنتے ہوئے دیکھا، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتلانا بھول گئے۔ حتیٰ کہ آرام کر کے وہاں سے پھر سفر شروع کر دیا، اس دن اور اس کے بعد رات سفر کر کے، جب دوسرے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھکاوٹ اور بھوک محسوس ہوئی، تو اپنے نوجوان ساتھی سے کہا کہ لاؤ بھی کھانا، کھانا کھا لیں۔ اس نے کہا، مچھلی تو، جہاں ہم نے پتھر سے ٹیک لگا کر آرام کیا تھا، وہاں زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی تھی اور وہاں عجب طریقے سے اس نے اپنا راستہ بنایا تھا، جس کا میں آپ سے تذکرہ کرنا بھول گیا۔ اور شیطان نے مجھے بھلا دیا۔

(۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا، اللہ کے بندے! جہاں مچھلی زندہ ہو کر غائب ہوئی تھی، وہی تو ہمارا مطلوبہ مقام تھا، جس کی تلاش میں ہم سفر کر رہے ہیں۔ چنانچہ اپنے نشانات قدم دیکھتے ہوئے پیچھے لوٹے اور اسی مجمع البحرین پر واپس آگئے۔ قَصَصًا کے معنی ہیں پیچھے لگنا، پیچھے پیچھے چلنا۔ یعنی نشانات قدم کو دیکھتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔

(۳) اس بندے سے مراد حضرت خضر ہیں، جیسا کہ صحیح احادیث میں صراحت ہے۔ خضر کے معنی سرسبز اور شاداب کے ہیں، یہ ایک مرتبہ سفید زمین پر بیٹھے تو وہ حصہ زمین ان کے نیچے سے سرسبز ہو کر لہلہانے لگا، اسی وجہ سے ان کا نام خضر پڑ گیا (صحیح بخاری، تفسیر سورہ کف)

ہم نے اپنے پاس کی خاص رحمت<sup>(۱)</sup> عطا فرما رکھی تھی اور اسے اپنے پاس سے خاص<sup>(۲)</sup> علم سکھا رکھا تھا۔ (۶۵)

اس سے موسیٰ نے کہا کہ میں آپ کی تابعداری کروں؟ کہ آپ مجھے اس نیک علم کو سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ (۶۶)

اس نے کہا آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ (۶۷)

اور جس چیز کو آپ نے اپنے علم میں<sup>(۳)</sup> نہ لیا ہو اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں؟ (۶۸)

موسیٰ نے جواب دیا کہ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور کسی بات میں میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔ (۶۹)

اس نے کہا اچھا اگر آپ میرے ساتھ ہی چلنے پر اصرار کرتے ہیں تو یاد رہے کسی چیز کی نسبت مجھ سے کچھ نہ پوچھنا جب تک کہ میں خود اس کی نسبت کوئی تذکرہ نہ کروں۔ (۷۰)

مِن لَدُنَّا عَلِمًا ۝

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِي  
مِمَّا عَلَّمْتَنِي رُبَّمَا ۝

قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝  
وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۝

قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ۝

قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ  
لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۝

(۱) رَحْمَةً سے بعض مفسرین نے وہ خصوصی انعامات مراد لیے ہیں جو اللہ نے اپنے اس خاص بندے پر فرمائے اور اکثر مفسرین نے اس سے مراد نبوت لی ہے۔

(۲) اس سے علم نبوت کے علاوہ جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بہرہ ور تھے، بعض تکوینی امور کا علم ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت خضر کو نوازا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھی وہ علم نہیں تھا۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے بعض صوفیاء دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو جو نبی نہیں ہوتے، علم لدنی سے نوازا ہے، جو بغیر استاد کے محض مبداء فیض کی کرم گستری کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ باطنی علم، شریعت کے ظاہری علم سے، جو قرآن و حدیث کی صورت میں موجود ہے، مختلف بلکہ بعض دفعہ اس کے مخالف اور معارض ہوتا ہے لیکن یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ حضرت خضر کی بابت تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کو علم خاص دیئے جانے کی صراحت کر دی ہے، جب کہ کسی اور کے لیے ایسی صراحت کہیں نہیں اگر اس کو عام کر دیا جائے تو پھر ہر شعبہ ہذا اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے، چنانچہ اس طبقے میں یہ دعوے عام ہی ہیں۔ اس لیے ایسے دعوؤں کی کوئی حیثیت نہیں۔

(۳) یعنی جس کا پورا علم نہ ہو۔

پھر وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک کشتی میں سوار ہوئے، تو اس نے کشتی کے تختے توڑ دیئے، موسیٰ نے کہا کیا آپ اسے توڑ رہے ہیں تاکہ کشتی والوں کو ڈبو دیں، یہ تو آپ نے بڑی (خطرناک) بات کر دی۔<sup>(۱)</sup> (۷۱)

اس نے جواب دیا کہ میں نے تو پہلے ہی تجھ سے کہہ دیا تھا کہ تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا۔ (۷۲)

موسیٰ نے جواب دیا کہ میری بھول پر مجھے نہ پکڑیے اور مجھے اپنے کام میں تنگی میں نہ ڈالیے۔<sup>(۲)</sup> (۷۳)

پھر دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک لڑکے کو پایا، اس نے اسے مار ڈالا، موسیٰ نے کہا کہ کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی جان کے عوض مار ڈالا؟ بیشک آپ نے تو بڑی ناپسندیدہ حرکت کی۔<sup>(۳)</sup> (۷۴)

فَانطَلَقَا حَتَّىٰ اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا قَالَ اَخْرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اٰهْلَهَا لَعَدَّ جَنَّتْ شَيْئًا اِمْرًا ۝۱

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۲

قَالَ لَا تَأْخِذْنِيْ بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ هُمْرًا ۝۳

فَانطَلَقَا حَتَّىٰ اِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَتَمَلَّتْهُ قَالِ اَقْتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَّعَدَّ جَنَّتْ شَيْئًا اَمْرًا ۝۴

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ اس علم خاص کی خبر نہیں تھی جس کی بنا پر حضرت نے کشتی کے تختے توڑ دیئے تھے، اس لیے صبر نہ کر سکے اور اپنے علم و فہم کے مطابق اسے نہایت ہولناک کام قرار دیا۔ امرًا کے معنی ہیں الذاہیۃ العظیمۃ ”بڑا ہیبت ناک کام“۔

(۲) یعنی میرے ساتھ یر کا معاملہ کریں، سختی کا نہیں۔

(۳) غلام سے مراد بالغ جوان بھی ہو سکتا ہے اور نابالغ بچہ بھی۔

(۴) نُنْكَرًا، فَظِيْعًا مُنْكَرًا لَا يُعْرَفُ فِي الشَّرْعِ، ایسا بڑا برا کام، جس کی شریعت میں گنجائش نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں اَنْكَرٌ مِنَ الْاَمْرِ الْاَوَّلِ پہلے کام (کشتی کے تختے توڑنے) سے زیادہ برا کام۔ اس لیے کہ قتل، ایسا کام ہے جس کا تدارک اور ازالہ ممکن نہیں۔ جب کہ کشتی کے تختے اکھیڑ دینا، ایسا کام ہے جس کا تدارک اور ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض نے اس کے معنی کیے ہیں، پہلے کام سے کم تر اَقْلٌ مِنَ الْاَمْرِ اس لیے کہ ایک جان کو قتل کرنا، سارے کشتی والوں کو ڈبو دینے سے کم تر ہے۔ (فتح القدیر) لیکن پہلا مفہوم ہی انب ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو علم شریعت حاصل تھا، اس کی رو سے حضرت خضر کا یہ کام بہر حال خلاف شرع تھا، جس کی وجہ سے انہوں نے اعتراض کیا اور اسے نہایت برا کام قرار دیا۔

وہ کہنے لگے کہ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ہمراہ رہ کر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ (۷۵)

موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا اگر اب اس کے بعد میں آپ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو بیشک آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا، یقیناً آپ میری طرف سے (حد) عذر<sup>(۱)</sup> کو پہنچ چکے۔ (۷۶)

پھر دونوں چلے ایک گاؤں والوں کے پاس آکر ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے ان کی مہمانداری سے صاف انکار کر دیا،<sup>(۲)</sup> دونوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گراہی چاہتی تھی، اس نے اسے ٹھیک اور درست<sup>(۳)</sup> کر دیا، موسیٰ (علیہ السلام) کہنے لگے اگر آپ چاہتے تو اس پر اجرت لے لیتے۔<sup>(۴)</sup> (۷۷)

اس نے کہا بس یہ جدائی ہے میرے اور تیرے درمیان،<sup>(۵)</sup>

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝

قَالَ إِنْ سَأَلْتِكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ هَذَا فَلَا تُصِغِبْنِي ۚ قَدْ بَلَغْتَ  
مِن لَّدُنِّي عُذْرًا ۝

فَانطَلَقَا سَحَابًا إِذْ آتَىٰ أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلُهَا فَأَبْوَأَانَ  
يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدَانِ أَنْ يُتَّقِصَّ  
فَأَقَامَهُ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ۝

قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ سَأَيْتُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ

(۱) یعنی اب اگر سوال کروں تو اپنی مصاحبت کے شرف سے مجھے محروم کر دیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، اس لیے کہ آپ کے پاس معقول عذر ہوگا۔

(۲) یعنی یہ بخیلوں اور لٹیروں کی بستی تھی کہ مہمانوں کی مہمان نوازی سے ہی انکار کر دیا، دراصل حالیکہ مسافروں کو کھانا کھلانا اور مہمان نوازی کرنا ہر شریعت کی اخلاقی تعلیمات کا اہم حصہ رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مہمان نوازی اور اکرام ضیافت کو ایمان کا تقاضا قرار دیا ہے۔ فرمایا «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ» اہلبیض القدیر شرح الجامع الصغیر ۲۰۹/۵۔ ”جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ مہمان کی عزت و تکریم کرے۔“

(۳) حضرت خضر نے اس دیوار کو ہاتھ لگایا اور اللہ کے حکم سے وہ معجزانہ طور پر سیدھی ہو گئی۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے واضح ہے۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام، جو اہل بستی کے رویے سے پہلے ہی کبیدہ خاطر تھے، حضرت خضر کے اس بلا معاوضہ احسان پر خاموش نہ رہ سکے اور بول پڑے کہ جب ان بستی والوں نے ہماری مسافرت، ضرورت مندی اور شرف و فضل کسی چیز کا بھی لحاظ نہیں کیا تو یہ لوگ کب اس لائق ہیں کہ ان کے ساتھ احسان کیا جائے؟

(۵) حضرت خضر نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام، یہ تیرا موقعہ ہے کہ تو صبر نہیں کر سکا اور اب خود تیرے کہنے کے مطابق میں تجھے ساتھ رکھنے سے معذور ہوں۔

عَلَيْهِ صَبْرًا ۝

اب میں تجھے ان باتوں کی اصلیت بھی بتا دوں گا جس پر تجھ سے صبر نہ ہو سکا۔<sup>(۷۸)</sup>

کشتی تو چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کاج کرتے تھے۔ میں نے اس میں کچھ توڑ پھوڑ کرنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک (صحیح سالم) کشتی کو جبراً ضبط کر لیتا تھا۔ (۷۹)

اور اس لڑکے کے ماں باپ ایمان والے تھے۔ ہمیں خوف ہوا کہ کہیں یہ انہیں اپنی سرکشی اور کفر سے عاجز و پریشان نہ کر دے۔ (۸۰)

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ۝

وَأَمَّا الْعُلَمَاءُ فَكَانَ أَبُوهُمُ الْمُؤْمِنِينَ فَأَخْبَيْنَا أَنْ يُرْهِمَهُمَا طَغْيَانًا وَكُفْرًا ۝

(۱) لیکن جدائی سے قبل حضرت خضر نے تینوں واقعات کی حقیقت سے انہیں آگاہ اور باخبر کرنا ضروری خیال کیا تاکہ موسیٰ علیہ السلام کسی مغالطے کا شکار نہ رہیں اور وہ یہ سمجھ لیں کہ علم نبوت اور ہے، جس سے انہیں نوازا گیا ہے اور بعض تکوینی امور کا علم اور ہے جو اللہ کی حکمت و مشیت کے تحت، حضرت خضر کو دیا گیا ہے اور اسی کے مطابق انہوں نے ایسے کام کیے جو علم شریعت کی رو سے جائز نہیں تھے اور اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام بجا طور پر ان پر خاموش نہیں رہ سکے تھے۔ انہی تکوینی امور کی انجام دہی کی وجہ سے بعض اہل علم کی رائے ہے کہ حضرت خضر انسانوں میں سے نہیں تھے اور اسی لیے وہ ان کی نبوت و رسالت یا ولایت کی بحث میں نہیں پڑتے کیوں کہ یہ سارے مناصب تو انسانوں کے ساتھ ہی خاص رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ فرشتے تھے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی کو بعض تکوینی امور سے مطلع کر کے ان کے ذریعے سے وہ کام کروالے، تو اس میں بھی کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ جب وہ صاحب وحی خود اس امر کی وضاحت کر دے کہ میں نے یہ کام اللہ کے حکم سے ہی کیے ہیں تو گو بظاہر وہ خلاف شریعت ہی نظر آتے ہوں، لیکن جب ان کا تعلق ہی تکوینی امور سے ہے تو وہاں جواز اور عدم جواز کی بحث ہی غیر ضروری ہے۔ جیسے تکوینی احکامات کے تحت کوئی بیمار ہوتا ہے، کوئی مرتا ہے، کسی کا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے، قوموں پر عذاب آتا ہے، ان میں سے بعض کام بعض دفعہ بہ اذن الہی فرشتے ہی کرتے ہیں، تو جس طرح یہ امور آج تک کسی کو خلاف شریعت نظر نہیں آئے۔ اسی طرح حضرت خضر کے ذریعے سے وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا تعلق بھی چوں کہ امور تکوینیہ سے ہے اس لیے انہیں شریعت کی ترازو میں تولنا ہی غیر صحیح ہے۔ البتہ اب وحی و نبوت کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد کسی شخص کا اس قسم کا دعویٰ ہرگز صحیح اور قابل تسلیم نہیں ہو گا جیسا کہ حضرت خضر سے منقول ہے کیوں کہ حضرت خضر کا معاملہ تو نص قرآنی سے ثابت ہے، اس لیے مجال انکار نہیں۔ لیکن اب جو بھی اس قسم کا دعویٰ یا عمل کرے گا، اس کا انکار لازمی اور ضروری ہے کیوں کہ اب وہ یقینی ذریعہ علم موجود نہیں ہے جس سے اس کے دعوے اور عمل کی حقیقت واضح ہو سکے۔

اس لیے ہم نے چاہا کہ انہیں ان کا پروردگار اس کے بدلے اس سے بہتر پاکیزگی والا اور اس سے زیادہ محبت اور پیار والا بچہ عنایت فرمائے۔ (۸۱)

دیوار کا قصہ یہ ہے کہ اس شہر میں دو یتیم بچے ہیں جن کا خزانہ ان کی اس دیوار کے نیچے دفن ہے، ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا تو تیرے رب کی چاہت تھی کہ یہ دونوں یتیم اپنی جوانی کی عمر میں آکر اپنا یہ خزانہ تیرے رب کی مہربانی اور رحمت سے نکال لیں، میں نے اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کیا،<sup>(۱)</sup> یہ تھی اصل حقیقت ان واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔ (۸۲)

آپ سے ذوالقرنین کا واقعہ یہ لوگ دریافت کر رہے ہیں،<sup>(۲)</sup> آپ کہہ دیجئے کہ میں ان کا تھوڑا سا حال تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔ (۸۳)

فَأَرَادْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا ۝

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزُ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۝

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ ذِي الْقُرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ۝

(۱) حضرت خضر کی نبوت کے قائلین کی یہ دوسری دلیل ہے جس سے وہ نبوت خضر کا اثبات کرتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی غیر نبی کے پاس اس قسم کی وحی نہیں آتی کہ وہ اتنے اتنے اہم کام کسی اشارہ غیبی پر کر دے، نہ کسی غیر نبی کا ایسا اشارہ غیبی قابل عمل ہی ہے۔ نبوت خضر کی طرح حیات خضر بھی ایک حلقے میں مختلف فیہ ہے اور حیات خضر کے قائلین بہت سے لوگوں کی ملاقاتیں حضرت خضر سے ثابت کرتے ہیں اور پھر ان سے ان کے اب تک زندہ ہونے پر استدلال کرتے ہیں لیکن جس طرح حضرت خضر کی زندگی پر کوئی نص شرعی نہیں ہے، اسی طریقے سے لوگوں کے مکاشفات یا حالت بیداری یا نوم میں حضرت خضر سے ملنے کے دعوے بھی قابل تسلیم نہیں۔ جب ان کا حلیہ ہی مستند ذریعے سے منقول نہیں ہے تو ان کی شناخت کس طرح ممکن ہے؟ اور کیوں کر یقین کیا جا سکتا ہے کہ جن بزرگوں نے ملنے کے دعوے کیے ہیں، واقعی ان کی ملاقات خضر موسیٰ علیہ السلام سے ہی ہوئی ہے، خضر کے نام سے انہیں کسی نے دھوکہ اور فریب میں مبتلا نہیں کیا۔

(۲) یہ مشرکین کے اس تیسرے سوال کا جواب ہے جو یہودیوں کے کہنے پر انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے تھے۔ ذوالقرنین کے لفظی معنی دو سینگوں والے کے ہیں۔ یہ نام اس لیے پڑا کہ فی الواقع اس کے سر پر دو سینگ تھے یا اس لیے کہ اس نے مشرق و مغرب دنیا کے دونوں کناروں پر پہنچ کر سورج کے قرن یعنی اس کی شعاع کا مشاہدہ کیا، بعض کہتے ہیں کہ اس کے سر پر بالوں کی دو لٹیں تھیں، قرن بالوں کی لٹ کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی دو لٹوں یا دو مینڈھیوں یا دو زلفوں والا۔ قدیم مفسرین نے بالعموم اس کا مصداق سکندر رومی کو قرار دیا ہے جس کی فتوحات کا دائرہ مشرق و مغرب تک پھیلا

إِنَّمَا مَكَالَهُ فِي الْأَرْضِ وَإِنِّي لَهُ مِن كَلِّ سَبَبًا ۝

فَاتَّبَعَهُ سَبَبًا ۝

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَرْبُؤُا فِي عَيْنِ حِمْيَةَ

ہم نے اسے زمین میں قوت عطا فرمائی تھی اور اسے ہر چیز کے <sup>(۱)</sup> سامان بھی عنایت کر دیے تھے۔ (۸۴)

وہ ایک راہ کے پیچھے لگا۔ <sup>(۲)</sup> (۸۵)

یہاں تک کہ سورج ڈوبنے کی جگہ پہنچ گیا اور اسے ایک دلدل کے چشمے میں غروب ہوتا ہوا پایا <sup>(۳)</sup> اور اس چشمے

ہوا تھا۔ لیکن جدید مفسرین جدید تاریخی معلومات کی روشنی میں اس سے اتفاق نہیں کرتے بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اس پر جو داد تحقیق دی ہے اور اس شخص کی دریافت میں جو محنت و کاوش کی ہے، وہ نہایت قابل قدر ہے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے ۱۔ کہ اس ذوالقرنین کی بابت قرآن نے صراحت کی ہے کہ وہ ایسا حکمران تھا، جس کو اللہ نے اسباب و وسائل کی فراوانی سے نوازا تھا ۲۔ وہ مشرقی اور مغربی ممالک کو فتح کرتا ہوا، ایک ایسے پہاڑی درے پر پہنچا جس کی دوسری طرف یاجوج اور ماجوج تھے۔ ۳۔ اس نے وہاں یاجوج ماجوج کا راستہ بند کرنے کے لیے ایک نہایت محکمہ بند تعمیر کیا ۴۔ وہ عادل، اللہ کو ماننے والا اور آخرت پر ایمان رکھنے والا تھا ۶۔ وہ نفس پرست اور مال و دولت کا حریص نہیں تھا۔ مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ ان خصوصیات کا حامل صرف فارس کا وہ عظیم حکمران ہے جسے یونانی سائرس، عبرانی خورس، اور عرب کیمسرو کے نام سے پکارتے ہیں، اس کا دور حکمرانی ۵۳۹ء قبل مسیح ہے۔ نیز فرماتے ہیں ۱۸۳۸ء میں سائرس کے ایک مجسمے کا بھی انکشاف ہوا جس میں سائرس کا جسم، اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ”ترجمان القرآن“ ج ۱، ص ۳۹۹-۴۳۰، طبع قدیم) واللہ اعلم بالصواب۔

(۱) سَبَبٌ کے اصلی معنی رسی کے ہیں، اس کا اطلاق ایسے ذریعے اور وسیلے پر ہوتا ہے جو حصول مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس اعتبار سے سَبَبًا کے معنی ہیں، ہم نے اسے ایسے ساز و سامان اور وسائل مہیا کیے، جن سے کام لے کر اس نے فتوحات حاصل کیں، دشمنوں کا غرور خاک میں ملایا اور ظالم حکمرانوں کو نیست و نابود کیا۔

(۲) دوسرے سبب کے معنی راستے کے کیے گئے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے وسائل سے مزید وسائل تیار اور مہیا کیے، جس طرح اللہ کے پیدا کردہ لوہے سے مختلف قسم کے ہتھیار اور اسی طرح دیگر خام مواد سے بہت سی اشیاء بنائی جاتی ہیں۔

(۳) عَيْنٌ سے مراد چشمہ یا سمندر ہے۔ حِمْيَةَ، کچھڑ، دلدل، وَجَدَ (پایا) یعنی دیکھا یا محسوس کیا۔ مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین جب مغربی جہت میں ملک پر ملک فتح کرتا ہوا، اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں آخری آبادی تھی وہاں گدلے پانی کا چشمہ یا سمندر تھا جو نیچے سے سیاہ معلوم ہوتا تھا اسے ایسا محسوس ہوا کہ گویا سورج اس چشمے میں ڈوب رہا ہے۔ ساحل سمندر سے یا دور سے، جس کے آگے حد نظر تک کچھ نہ ہو، غروب شمس کا نظارہ کرنے والوں کو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ سورج سمندر میں یا زمین میں ڈوب رہا ہے حالانکہ وہ اپنے مقام آسمان پر ہی ہوتا ہے۔

کے پاس ایک قوم کو بھی پایا، ہم نے فرمادیا (۱) کہ اے ذوالقرنین! یا تو تو انہیں تکلیف پہنچائے یا ان کے بارے میں تو کوئی بہترین روش اختیار کرے۔ (۸۶) (۲)

اس نے کہا کہ جو ظلم کرے گا اسے تو ہم بھی اب سزا دیں گے، (۳) پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جائے گا اور وہ اسے سخت تر عذاب دے گا۔ (۸۷)

ہاں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے اس کے لیے تو بدلے میں بھلائی ہے اور ہم اسے اپنے کام میں بھی آسانی ہی کا حکم دیں گے۔ (۸۸)

پھر وہ اور راہ کے پیچھے لگا۔ (۸۹) (۴)

یہاں تک کہ جب سورج نکلنے کی جگہ تک پہنچا تو اسے ایک ایسی قوم پر ٹکٹا پایا کہ ان کے لیے ہم نے اس سے اور کوئی اوٹ نہیں بنائی۔ (۹۰) (۵)

واقعہ ایسا ہی ہے اور ہم نے اس کے پاس کی کل خبروں کا احاطہ (۶) کر رکھا ہے۔ (۹۱)

وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا يَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّمَا أَنْتَ مُعَذِّبٌ وَإِنَّمَا أَنْتَ تُخَدَعُ فِيهِمْ حَسَنًا ۝

قَالَ إِنَّمَا مِنْ ظَلَمٍ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا ثَمَرًا ۝

وَإِنَّمَا مِنْ أَمْرٍ وَمَعْمَلٍ صَالِحٍ أَقَلُّهُ جَزَاءً لِحُسْنِهِ ۚ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُتْرًا ۝

ثُمَّ اتَّبَعَهُ سَبًّا ۝

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَىٰ قَوْمٍ لَمْ يَجْعَلْ لَهُم مِّنْ دُونِهَا سَبًّا ۝

كَذَلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝

(۱) قُلْنَا (ہم نے کہا) بذریعہ وحی، اسی سے بعض علما نے ان کی نبوت پر استدلال کیا ہے۔ اور جو ان کی نبوت کے قائل نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس وقت کے پیغمبر کے ذریعے سے ہم نے اس سے کہا۔

(۲) یعنی ہم نے اس قوم پر غلبہ دے کر اختیار دے دیا کہ چاہے تو اسے قتل کرے اور قیدی بنا لے یا فدیہ لے کر یا بطور احسان چھوڑ دے۔

(۳) یعنی جو کفر و شرک پر جمار ہے گا، اسے ہم سزا دیں گے یعنی کچھلی غلطیوں پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

(۴) یعنی اب مغرب سے مشرق کی طرف سفر اختیار کیا۔

(۵) یعنی ایسی جگہ پہنچ گیا جو مشرقی جانب کی آخری آبادی تھی، اسی کو مطلع الشمس کہا گیا ہے۔ جہاں اس نے ایسی قوم دیکھی جو مکانوں میں رہنے کی بجائے میدانوں اور صحراؤں میں بسیرا کیے ہوئے، لباس سے بھی آزاد تھی۔ یہ مطلب ہے ان کے اور سورج کے درمیان کوئی پردہ اور اوٹ نہیں تھی۔ سورج ان کے ننگے جسموں پر طلوع ہوتا۔

(۶) یعنی ذوالقرنین کی بابت ہم نے جو بیان کیا ہے وہ اسی طرح ہے کہ پہلے وہ منتہائے مغرب اور پھر منتہائے مشرق میں پہنچا اور ہمیں اس کی تمام صلاحیتوں، اسباب و وسائل اور دیگر تمام باتوں کا پورا علم ہے۔

ثُمَّ اتَّبَعَهُ سَبَبًا ۱۲

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُونِهِمَا قَوْمًا لَا يَكَادُونَ

يَفْقَهُونَ قَوْلًا ۱۳

قَالُوا يَا أَيُّهَا الْقُرْنَيْنِ إِنَّ يَا جُوجَ وَمَا جُوجَ مُفْسِدُونَ فِي

الْأَرْضِ قَهْلٌ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَىٰ أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا

وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۱۴

قَالَ مَا مَلِكِي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ

وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۱۵

الْثَوْنِي زُبْرًا لِحَدِيدٍ حَتَّىٰ إِذَا اسَّأَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوا

حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ الْثَوْنِي أَفْرِغْ عَلَيْهِ قَطْرًا ۱۶

وہ پھر ایک سفر کے سامان میں لگا۔<sup>(۱)</sup> (۹۲)

یہاں تک کہ جب دو دیواروں<sup>(۲)</sup> کے درمیان پہنچا ان

دونوں کے پرے اس نے ایک ایسی قوم پائی جو بات سمجھنے

کے قریب بھی نہ تھی۔<sup>(۳)</sup> (۹۳)

انہوں نے کہا کہ اے ذوالقرنین!<sup>(۴)</sup> یا جوج ماجوج اس

ملک میں (بڑے بھاری) فساد ہی ہیں،<sup>(۵)</sup> تو کیا ہم آپ کے

لیے کچھ خرچ کا انتظام کر دیں؟ (اس شرط پر کہ) آپ

ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیں۔ (۹۴)

اس نے جواب دیا کہ میرے اختیار میں میرے پروردگار

نے جو دے رکھا ہے وہی بہتر ہے، تم صرف قوت<sup>(۶)</sup>

طاقت سے میری مدد کرو۔ (۹۵)

میں تم میں اور ان میں مضبوط حجاب بنا دیتا ہوں۔ مجھے

لوہے کی چادریں لا دو۔ یہاں تک کہ جب ان دونوں

پہاڑوں کے درمیان دیوار برابر کر دی<sup>(۷)</sup> تو حکم دیا کہ

آگ تیز جلاؤ تا وقتیکہ لوہے کی ان چادروں کو بالکل

(۱) یعنی اب اس کا رخ کسی اور طرف ہو گیا۔

(۲) اس سے مراد دو پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل تھے، ان کے درمیان کھائی تھی، جس سے یا جوج و ماجوج ادھر

آبادی میں آجاتے اور اودھم مچاتے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے۔

(۳) یعنی اپنی زبان کے سوا کسی اور کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔

(۴) ذوالقرنین سے یہ خطاب یا تو کسی ترجمان کے ذریعے ہوا ہو گا یا اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو جو خصوصی اسباب و

وسائل مہیا فرمائے تھے، انہی میں مختلف زبانوں کا علم بھی ہو سکتا ہے اور یوں یہ خطاب براہ راست بھی ہو سکتا ہے۔

(۵) یا جوج و ماجوج یہ دو قومیں ہیں اور حدیث صحیح کے مطابق نسل انسانی میں سے ہیں اور ان کی تعداد دو سری انسانی

نسلوں کے مقابلے میں زیادہ ہوگی اور انہی سے جہنم زیادہ بھرے گی (صحیح بخاری۔ تفسیر سورة الحج والرقاق

باب إن زلزلة الساعة شيء عظيم۔ ومسلم۔ كتاب الإيمان۔ باب "قوله يقول الله لا دم" أخرج بعث النار)

(۶) قوت سے مراد یعنی تم مجھے تمیراتی سامان اور رجال کا مہیا کرو۔

(۷) بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ یعنی دونوں پہاڑوں کے سروں کے درمیان جو خلا تھا اسے لوہے کی چھوٹی چھوٹی چادروں سے پر کر دیا۔

آگ کر دیا، تو فرمایا میرے پاس لاؤ اس پر پگھلا ہوا  
تانبا ڈال دوں۔<sup>(۱)</sup> (۹۶)

پس تو ان میں اس دیوار کے اوپر چڑھنے کی طاقت تھی  
اور نہ اس میں کوئی سوراخ کر سکتے تھے۔ (۹۷)

کما یہ صرف میرے رب کی مہربانی ہے ہاں جب میرے  
رب کا وعدہ آئے گا تو اسے زمین بوس کر دے گا،<sup>(۲)</sup>

بیشک میرے رب کا وعدہ سچا اور حق ہے۔ (۹۸)

فَمَا اسْتَطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ۝

قَالَ هَذَا حِمَّةٌ مِّنْ رَبِّي فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۝

وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ۝

(۱) قَطْرًا۔ پگھلا ہوا سیسہ، یا لوہا یا تانبا۔ یعنی لوہے کی چادروں کو خوب گرم کر کے ان پر پگھلا ہوا لوہا، تانبا یا سیسہ ڈالنے سے وہ پہاڑی درہ یا راستہ ایسا مضبوط ہو گیا کہ اسے عبور کر کے یا توڑ کر یا جوج و ماجوج کا ادھر دو سری انسانی آبادیوں میں آنا ناممکن ہو گیا۔

(۲) یعنی یہ دیوار اگرچہ بڑی مضبوط بنا دی گئی جس کے اوپر چڑھ کر یا اس میں سوراخ کر کے یا جوج و ماجوج کا ادھر آنا ممکن نہیں ہے لیکن جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا، تو وہ اسے ریزہ ریزہ کر کے زمین کے برابر کر دے گا، اس وعدے سے مراد قیامت کے قریب یا جوج و ماجوج کا ظہور ہے جیسا کہ احادیث میں ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دیوار میں تھوڑے سے سوراخ کو فتنے کے قریب ہونے سے تعبیر فرمایا (صحیح بخاری، نمبر ۳۳۳۶، و مسلم، نمبر ۲۲۰۸) ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ وہ ہر روز اس دیوار کو کھودتے ہیں اور پھر کل کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن جب اللہ کی مشیت ان کے خروج کی ہوگی تو پھر وہ کہیں گے کل ان شاء اللہ اس کو کھودیں گے اور پھر دوسرے دن وہ اس سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ زمین میں فساد پھیلانے کے حتیٰ کہ لوگ قلعہ بند ہو جائیں گے، یہ آسمانوں پر تیر پھینکیں گے جو خون آلودہ لوٹیں گے، بالآخر اللہ تعالیٰ ان کی گدیوں پر ایسا کھڑا پیدا فرمادے گا جس سے ان کی ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ (مسند أحمد ۱۲ / ۵۱۱، جامع ترمذی نمبر ۳۱۵۲، والأحادیث الصحیحة للالبانی، نمبر ۱۱۷۳۵) صحیح مسلم میں نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی روایت میں صراحت ہے کہ یا جوج و ماجوج کا ظہور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ان کی موجودگی میں ہوگا (کتاب الفتن وأشیراط الساعة، باب ذکر الدجال، جس سے ان حضرات کی تردید ہو جاتی ہے، جو کہتے ہیں کہ تاتاریوں کا مسلمانوں پر حملہ، یا منگول ترک جن میں سے چنگیز بھی تھا یا روسی یا چینی قومیں یہی یا جوج و ماجوج ہیں، جن کا ظہور ہو چکا۔ یا مغربی قومیں ان کا مصداق ہیں کہ پوری دنیا میں ان کا غلبہ و تسلط ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں کیوں کہ ان کے غلبے سے سیاسی غلبہ مراد نہیں ہے بلکہ قتل و غارت گری اور شر و فساد کا وہ عارضی غلبہ ہے جس کا مقابلہ کرنے کی طاقت مسلمانوں میں نہیں ہوگی، تاہم پھر وہابی مرض سے سب کے سب ان واحد میں لقمہ اجل بن جائیں گے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجًا فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ  
فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ۙ

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِلْكَافِرِينَ عَرْضًا ۙ

الَّذِينَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِي غَطَاةٍ عَنْ ذِكْرِنَا وَكَانُوا  
لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ۙ

اَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا اَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ  
دُوْنِ اَوْلِيَاءِنَا اِنَّا اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ۙ

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۙ

الَّذِيْنَ صَلَّى سَعِيَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ  
اَنْهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۙ

اُولٰٓئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلَعَلَّاهُمْ فَنَحِطَتْ

اس دن ہم انہیں آپس میں ایک دوسرے میں گڈمڈ  
ہوتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور صور پھونک دیا جائے گا  
پس سب کو اکٹھا کر کے ہم جمع کر لیں گے۔ (۹۹)  
اس دن ہم جہنم کو (بھی) کافروں کے سامنے لاکھڑا کر دیں  
گے۔ (۱۰۰)

جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھی اور (امر  
حق) سن بھی نہیں سکتے تھے۔ (۱۰۱)  
کیا کافر یہ خیال کیے بیٹھے ہیں؟ کہ میرے سوا وہ میرے  
بندوں کو اپنا حمایتی بنا لیں گے؟ (سنو) ہم نے تو ان کفار کی  
ممانی کے لیے جہنم کو تیار کر رکھا ہے۔ (۱۰۲) <sup>(۱)</sup>

کہہ دیجئے کہ اگر (تم کو تو) میں تمہیں بتا دوں کہ باعتبار  
اعمال سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ (۱۰۳)  
وہ ہیں کہ جنکی دنیوی زندگی کی تمام ترکوششیں بیکار ہو گئیں اور  
وہ اسی گمان میں رہے کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔ (۱۰۴) <sup>(۲)</sup>  
یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور  
اس کی ملاقات سے کفر کیا، <sup>(۳)</sup> اس لیے ان کے اعمال

(۱) حَسِبَ، بمعنی ظَنَّ ہے اور عِبَادِي (میرے بندوں) سے مراد ملائکہ، مسیح علیہ السلام اور دیگر صالحین ہیں، جن کو  
حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جاتا ہے، اسی طرح شیاطین و جنات ہیں جن کی عبادت کی جاتی ہے۔ اور استفہام زجر و توبیخ  
کے لیے ہے۔ یعنی غیر اللہ کے یہ پجاری کیا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر اور میرے بندوں کی عبادت کر کے ان کی  
حمایت سے میرے عذاب سے بچ جائیں گے؟ یہ ناممکن ہے، ہم نے تو ان کافروں کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں  
جانے سے ان کو وہ بندے نہیں روک سکیں گے جن کی یہ عبادت کرتے اور ان کو اپنا حمایتی سمجھتے ہیں۔

(۲) یعنی اعمال ان کے ایسے ہیں جو اللہ کے ہاں ناپسندیدہ ہیں، لیکن بزعم خویش سمجھتے یہ ہیں کہ وہ بہت اچھے کام کر رہے  
ہیں۔ اس سے مراد کون ہیں؟ بعض کہتے ہیں، یہود و نصاریٰ ہیں، بعض کہتے ہیں خوارج اور دیگر اہل بدعت ہیں، بعض  
کہتے ہیں کہ مشرکین ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ آیت عام ہے جس میں ہر وہ فرد اور گروہ شامل ہے جس کے اندر مذکورہ  
صفات ہوں گی۔ آگے ایسے ہی لوگوں کی بابت مزید وعیدیں بیان کی جا رہی ہیں۔

(۳) رب کی آیات سے مراد توحید کے وہ دلائل ہیں جو کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ آیات تشریحی ہیں جو اس نے

غارت ہو گئے پس قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔<sup>(۱)</sup> (۱۰۵)

حال یہ ہے کہ ان کا بدلہ جنم ہے کیونکہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور میرے رسولوں کو مذاق میں اڑایا۔ (۱۰۶)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے کام بھی اچھے کیے یقیناً ان کے لیے الفردوس<sup>(۲)</sup> کے باغات کی مہمانی ہے۔ (۱۰۷)  
جہاں وہ ہمیشہ رہا کریں گے جس جگہ کو بدلنے کا کبھی بھی ان کا ارادہ ہی نہ ہو گا۔<sup>(۳)</sup> (۱۰۸)

کہہ دیجئے کہ اگر میرے پروردگار کی باتوں کے<sup>(۴)</sup> لکھنے کے لیے سمندر سیاہی بن جائے تو وہ بھی میرے رب کی

أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝

ذَلِكَ جَزَاءُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَأَخَذُوا الْآيَاتِ وَرُسُلَهُمْ زُرُوا ۝

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝

خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ۝

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِثْقَالَ رَيْبٍ لَقِنْدًا الْبَعْرُ قَبْلَ أَنْ تُنْفَذَ

اپنی کتابوں میں نازل کیں اور پیغمبروں نے ان کی تبلیغ و توضیح کی۔ اور رب کی ملاقات سے کفر کا مطلب آخرت کی زندگی اور دوبارہ جی اٹھنے سے انکار ہے۔

(۱) یعنی ہمارے ہاں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی یا یہ مطلب ہے کہ ہم ان کے لیے میزان کا اہتمام ہی نہیں کریں گے کہ جس میں ان کے اعمال تولے جائیں، اس لیے کہ اعمال تو ان موحدین کے تولے جائیں گے جن کے نامہ اعمال میں نیکیاں اور برائیاں دونوں ہوں گی، جب کہ ان کے نامہ اعمال، سنات سے بالکل خالی ہوں گے جس طرح حدیث میں آتا ہے کہ ”قیامت والے دن موٹا تازہ آدمی آئے گا، اللہ کے ہاں اس کا اتنا وزن نہیں ہو گا جتنا مچھر کے پر کا ہوتا ہے“ پھر آپ ﷺ نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔ (صحیح بخاری۔ سورۃ الکہف)

(۲) جنت الفردوس، جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”جب بھی تم اللہ سے جنت کا سوال کرو تو الفردوس کا سوال کرو، اس لیے کہ وہ جنت کا اعلیٰ حصہ ہے اور وہیں سے جنت کی نہریں پھوٹی ہیں۔“

(البخاری کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی الماء)

(۳) یعنی اہل جنت، جنت اور اس کی نعمتوں سے کبھی نہ اکتائیں گے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ منتقل ہونے کی خواہش ظاہر کریں۔

(۴) کَلِمَاتٍ سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم محیط، اس کی حکمتیں اور وہ دلائل و براہین ہیں جو اس کی وحدانیت پر دال ہیں۔ انسانی عقلیں ان سب کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور دنیا بھر کے درختوں کے قلم بن جائیں اور سارے سمندر بلکہ ان کی مثل اور بھی سمندر ہوں، وہ سب سیاہی میں بدل جائیں، قلم گھس جائیں گے اور سیاہی ختم ہو جائے گی، لیکن رب کے کلمات اور اس کی حکمتیں ضبط تحریر میں نہیں آسکیں گی۔

كَلِمَاتٍ رَبِّيَ وَلَوْ جِئْتَنَا بِبَيِّنَاتٍ مَّدَدًا ۝

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ الْكَلِمَاتُ وَالَّذِي مَن كَانَ  
يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ۝

باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا، گو ہم  
اسی جیسا اور بھی اس کی مدد میں لے آئیں۔ (۱۰۹)  
آپ کہہ دیجئے کہ میں تو تم جیسا ہی ایک انسان  
ہوں۔<sup>(۱)</sup> (ہاں) میری جانب وحی کی جاتی ہے کہ سب کا  
معبود صرف ایک ہی معبود ہے،<sup>(۲)</sup> تو جسے بھی اپنے  
پروردگار سے ملنے کی آرزو ہو اسے چاہیے کہ نیک  
اعمال کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت<sup>(۳)</sup> میں کسی کو  
بھی شریک نہ کرے۔ (۱۱۰)

سورہ مریم مکی ہے اور اس میں اٹھانوے آیتیں اور  
چھ رکوع ہیں۔

شروع کرتا ہوں میں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان  
نہایت رحم والا ہے۔  
کبھی (۱) یہ ہے تیرے پروردگار کی اس مہربانی کا ذکر  
جو اس نے اپنے بندے زکریا<sup>(۳)</sup> پر کی تھی۔ (۲)

سُورَةُ مَرْيَمَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كَلِمَاتٍ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكْرِیَّا ۝

(۱) اس لیے میں بھی رب کی باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

(۲) البتہ مجھے یہ امتیاز حاصل ہے کہ مجھ پر وحی الہی آتی ہے۔ اسی وحی کی بدولت میں نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے  
متعلق اللہ کی طرف سے نازل کردہ وہ باتیں بیان کی ہیں جن پر مردِ ایام کی دبیز تہیں پڑی ہوئی تھیں یا ان کی حقیقت  
افسانوں میں گم ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں اس وحی میں سب سے اہم حکم یہ دیا گیا ہے کہ تم سب کا معبود صرف ایک ہے۔  
(۳) عمل صالح وہ ہے جو سنت کے مطابق ہو، یعنی جو اپنے رب کی ملاقات کا یقین رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ ہر عمل  
سنت نبوی کے مطابق کرے۔ اور دوسرے، اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اس لیے کہ بدعت اور شرک  
دونوں ہی جبطِ اعمال کا سبب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

☆ ہجرت حبشہ کے واقعات میں بیان کیا گیا ہے کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور اسکے مصاحبین اور امرا کے سامنے جب سورہ  
مریم کا ابتدائی حصہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے پڑھ کر سنایا تو ان سب کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور نجاشی  
نے کہا کہ یہ قرآن اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو لے کر آئے ہیں، یہ سب ایک ہی مشعل کی کرنیں ہیں (فتح القدر)

(۳) حضرت زکریا علیہ السلام، انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ یہ بڑھتی تھی اور یہی پیشہ ان کا ذریعہ آمدنی تھا۔